ISSN 2321-4627

فروری 2023ء

-/15روپے

ماہنامہ

# قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

**QAUMI ZABAN** Monthly, Hyderabad

## جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ

عزت مآب وزیراعلیٰ حکومت تلنگانہ

69 ویں سالگرہ مبارک

جناب کوپو لا ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود و بہبودیٔ معمر شہریان حکومت تلنگانہ نے کل ہند صنعتی نمائش میں تلنگانہ اقلیتی اقامتی اسکولس سوسائٹی کے اسٹال کا افتتاح کیا۔اس موقع پر جناب بی۔شفیع اللہ آئی ایف ایس سکریٹری تلنگانہ اقلیتی اقامتی اسکولس سوسائٹی' جناب محمد دلاور ایڈیشنل سکریٹری ٹمریس' طالبات و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں



26 جنوری 2023 کو یوم جمہوریہ کے موقع پر صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی پر پرچم کشائی انجام دیتے ہوئے۔ تصویر میں جناب امتیاز اسحٰق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن' مسٹروی۔کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی' عہدیداران وارا کین عملہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ودیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں۔

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد
تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈمی کا علمی، ادبی، ثقافتی و تہذیبی جریدہ
QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد :08 شمارہ : 02 فروری 2023ء

زیرنگرانی
محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈمی

ایڈیٹر
بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس
ڈائرکٹر سکریٹری (FAC)
تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈمی

**ناشر و طابع**

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد-500 001 (تلنگانہ)

**مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی**

ترتیب وتزئین : محمد ارشد مبین زبیری
کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپئے سالانہ -/150 روپئے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by B. Shafiullah IFS and published by B. Shafiullah IFS on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S.

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

# قرینہ


| | | |
|---|---|---|
| ہم کلامی | بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس ڈائرکٹر سکریٹری (FAC) | 4 |
| اپنی بات | محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی | 5 |

**یادرفتگاں**

| | | |
|---|---|---|
| واحد حاضر، جمع غائب | شوکت تھانوی | 6 |
| یارِ غمگسار کی بات (مخدوم محی الدین شخص اور شاعری | ڈاکٹر عقیل ہاشمی | 11 |
| مکرم جاہ بہادر: شخصیت، حیات اور خدمات | عبدالرحمٰن پاشا | 16 |
| سرراس مسعود | نوید مسعود | 22 |

**مضامین**

| | | |
|---|---|---|
| ''سفر ہے شرط'' عورت کے سفرِ حیات کا ساگا | ڈاکٹر آمنہ تحسین | 26 |
| ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا علمبردار ''کبیر'' | ڈاکٹر سنتوش کمار جئے ہند | 31 |
| جدید غزل کے بنیادی مبادیات | ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر | 34 |
| اُردو کی بنیادی مہارتوں کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال | شبانہ معظم و ڈاکٹر سید امان عبید | 40 |
| فلاحی اسکیمیں اور معذورین کے سماجی و معاشی مسائل | ڈاکٹر سیدہ صبا قادری | 48 |
| فن خوشنویسی اور کچھ ہندو خطاط | انصار احمد معروفی | 54 |
| حافظ شیرازی اور غالب کی شاعری کا تقابلی جائزہ | سلیمان زراع | 59 |
| ردِ نوآبادیات اور ترقی پسند اُردو افسانہ | معراج دین شیخ | 65 |
| داراشکوہ کی تحریریں | عامر اعظم | 70 |
| ڈاکٹر عبدالحق کی تعلیمی خدمات اور اس کی معنویت | الطاف احمد | 75 |
| صادقہ نواب سحر کے افسانوں کی سحرانگیزی | صاعقہ غیاث | 78 |

**حصہ نظم**

| | | |
|---|---|---|
| غزلیں | ڈاکٹر محسن جلگانوی / ولی محمد زاہد ہریانوی | 81 |
| غزلیں | کشور سلطانہ / ڈاکٹر معین افروز | 82 |


oOo

# ہم کلامی

ماہ فروری 2023ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔اس ماہ کے رسالے کو ہم نے یادرفتگاں کے عنوان کے تحت چار مضامین سے زینت دی ہے۔جس میں مشہور مزاح نگار ادیب وشاعر شوکت تھانوی کا ایک طنز ومزاح سے بھرپور تحریر ''واحد حاضر،جمع غائب'' اس کے بعد سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا دکن کے شاعر انقلاب مخدوم محی الدین پر بسیط مضمون، عبدالرحمٰن پاشا کا نواب والا شان میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر پر لکھا مضمون اور سرسید احمد خان کے پوترے سرراس مسعود پر جناب نوید مسعود کی تحریر شامل ہے۔شمارے کے دیگر مشمولات میں ڈاکٹر آمنہ تحسین کا ''سفر ہے شرط'' عورت کے سفر حیات کا ساگا'' کے عنوان سے ممتاز فکشن نگار محترمہ قمر جمالی کے ناول پر مضمون، ڈاکٹر سنتوش کمار کا کبیر داس پر ''ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا علم بردار'' کبیر'' کے عنوان سے مضمون، ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر کی ''جدید غزل کے بنیادی مبادیات'' کے عنوان سے تحریر اور اسی طرح دیگر قلم کاروں اور ریسرچ اسکالرس کے مضامین اس ماہ کے شمارے میں شامل اشاعت ہیں۔حسب معمول آخر میں ممتاز شعرائے کرام ڈاکٹر محسن جلگانوی، جناب زاہد ہریانوی، ڈاکٹر معین افروز اور محترمہ کشور سلطانہ کا کلام شائع کیا گیا ہے۔

نئے سال کے آغاز میں سابق والی ریاست حیدرآباد نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ ہفتم کے وارث آصف جاہ ہشتم نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ان کے ساتھ آصف جاہوں کے ایک باب کا اختتام ہوا۔آصف جاہی حکمرانوں نے ریاست حیدرآباد و برار پر دوسو سال سے زائد عرصہ تک پورے عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کی اور ان حکمرانوں نے بلالحاظ مذہب وملت اپنی سماجی، عوامی اور تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، خاص کر نظام ہفتم نواب میر عثمان علی خان بہادر نے جو عوامی اور تعلیمی کارنامے انجام دیے ہیں انہیں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ان خدمات میں ایک طرف دواخانہ عثمانیہ، نظام انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسس، ہائی کورٹ اور شفاخانہ یونانی کی عظیم الشان عمارتیں ہیں تو دوسری طرف عثمانیہ یونیورسٹی، سٹی کالج، نظام کالج اور کئی تعلیمی ادارے، اسی طرح رفاہی کاموں میں عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر اور پانی کے کئی ذخائر اپنی شان وشوکت کا ثبوت دے رہے ہیں۔مکرم جاہ بہادر بھی اپنے دادا نواب میر عثمان علی خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عوامی اور تعلیمی خدمات میں مصروف تھے۔وہ نظام چیریٹیبل ٹرسٹ اور ایجوکیشنل ٹرسٹ کے سرپرست تھے اور آج بھی ان ٹرسٹوں کے ذریعہ لاکھوں لوگوں کو روزگار اور تعلیم میں کافی اعانت ہورہی ہے۔ہم مکرم جاہ بہادر کے انتقال پر ملال پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب العزت انہیں غریق رحمت کرے، ان کے درجات بلند کرے اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی فروغ اردو کی اسکیمات پر عمل پیرا ہے۔ان اسکیمات میں اردو مصنفین کی سال 2020 کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت کی پہلی قسط متعلقہ منظورہ مصنفین کو روانہ کردی گئی ہے، مصنفین سے آٹھ آٹھ طبع شدہ کتابوں کی وصولی کے بعد دوسری قسط کی رقم کی ادائیگی بھی جلد کردی جائے گی۔سال 2019 اور 2020 کی مطبوعہ کتابوں پر انعامات جاری کردیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں اردو مصنفین کی سال 2021 کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت اور سال 20-2019 اور 21-2020 کے بیسٹ ٹیچر ایوارڈز کے لئے بھی درخواستیں وصول ہوئی ہیں۔ان درخواستوں کی تنقیح اور جانچ کے بعد ان اسکیمات پر بھی جلد عمل آوری ہوجائے گی۔آپ کے مشوروں کا طالب۔

بی۔ شفیع اللہ آئی ایف ایس
ایڈیٹر

# اپنی بات

ماہ جنوری 2023ء میں اہلیان دکن سابق والیٔ ریاست حیدرآباد نواب میر عثمان علی خان بہادر کے وارث نواب والا شان میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کے انتقال کے سانحے سے گزرے ہیں۔حیدرآباد فرخندہ بنیاد جس کی تہذیب وتمدن کو قطب شاہوں نے سنوارا تھا'اس شہر کو چارمینار' مکہ مسجد جیسی عظیم الشان نشانیاں دی تھیں اور رودِموسیٰ پر پل اور راستے بنائے تھے'وہیں آصف جاہوں نے بھی اس ریاست حیدرآباد کی تہذیب وثقافت اور نادر تعمیرات اور علمی خزانوں کے ذریعہ بلاتفریق مذہب وذات راست لوگوں کے دلوں پر حکومت کی تھی' خاص کر نواب میر عثمان علی خان کے دور میں تعلیم' صنعت وحرفت اور جورفاہی کام انجام پائے ان کی وجہ سے اس سلطنتِ آصف جاہ کا نام دنیا میں روشن تھا۔اس روایت کو ان کے وارث نظام ہشتم نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر نے بھی جاری رکھا تھا' وہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھی بحیثیت وارثِ نظام ہفتم ہمارے درمیان تھے' وہ نظام چیارٹیبل ٹرسٹ اور ایجوکیشن ٹرسٹ کے سربراہ تھے'ان ٹرسٹوں کے ذریعہ لاکھوں افراد وطلباء آج تک بھی مستفید ہورہے ہیں۔مکرم جاہ بہادر کی رحلت نے ان کے تمام متعلقین سمیت ہمارے عزت مآب وزیراعلیٰ جناب چندراشیکھر راؤ صاحب کو بھی غمگسار کیا ہے۔اس کا اظہار انہوں نے خود مکرم جاہ بہادر کے آخری دیدار کے وقت کیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ مرحوم مکرم جاہ بہادر کی مغفرت فرمائے'انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور تمام متعلقین وچاہنے والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

قارئین جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہرخطہ اور ہرعلاقہ کی ایک زبان ہوتی ہے جو آپسی میل ملاپ اور رابطہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔اردو بھی ہمارے ملک کی زبان ہے جو یہیں پیدا ہوئی' پلی بڑھی۔اس زبان نے زمانے کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے' دکن میں تو یہ بہت ہی پروان چڑھی اور آج بھی سارے ملک میں دکن میں ہی اس زبان کی دھوم ہے۔ہمارے ہردلعزیز وزیراعلیٰ بھی اس زبان کے بولنے اور چاہنے والے ہیں وہ اس زبان کو ریاست تلنگانہ میں مزید ترقی پر دیکھنا چاہتے ہیں اسی غرض کے تحت انہوں نے ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی ہے اور اس کی باضابطہ عمل آوری کے لئے اہم سرکاری محکموں میں 66اردو آفیسرس کا تقرر عمل میں لایا گیا تاکہ اردو میں آنے والی درخواستوں کے پڑھنے اور سمجھنے میں اور ان کے مسائل کے حل کرنے اور کارروائی کرنے میں آسانی ہو۔یہ عمل دفاتر میں آج بھی جاری ہے اور ان اردو آفیسرس سے اردوداں حضرات مستفید ہورہے ہیں۔حکومت تلنگانہ کی یہی کوشش رہی کہ ہرطبقہ اور یہاں کی اکثریتی واقلیتی زبان کے بولنے' لکھنے والوں کو ان کے کاموں میں سہولت ہو۔اس کے علاوہ اردو زبان وادب کی ترقی' ترویج' فروغ وتحفظ کے ضمن میں اردو اکیڈیمی کے ذریعہ کئی ایک اسکیمس و پروگرامس جاری ہیں جن میں ہرسال اردو دانشوروں واساتذہ کو مولانا آزاد قومی ومخدوم محی الدین ریاستی ایوارڈز'اساتذہ' اسکالرس'صحافیوں اور اردو کاز کے لئے اپنی زندگیاں لگانے والوں کو کارنامہ حیات ایوارڈ'اردو مصنفین کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت' اردو کی طبع شدہ کتابوں پر انعامات' بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ' چھوٹے اردو اخبارات اور اردو الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کی مالی اعانت' اردو خبررساں ایجنسیوں کی مالی اعانت اور اردو انجمنوں' رضاکارانہ تنظیموں کو مشاعروں سمینارس اور سمپوزیمس منعقد کرنے مالی اعانت اور بھی اردو کی ترقی کی کئی اسکیمیں جاری ہیں۔

اُردو کے متوالوں' اساتذہ' ادباوشعراء' اسکالرس اور محبانِ اردو سے ملتمس ہوں کہ اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلہ میں اپنے زرین مشوروں سے نوازتے رہیں کہ آپ کی آراء ہمارے لئے باعث ہمت افزائی ورہنمائی ہیں۔

محمد خواجہ مجیب الدین

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد





# واحد حاضر، جمع غائب

رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان کو اپنے مضمون نگاروں کی طرف سے ایک غلط فہمی ہمیشہ رہا کرتی ہے کہ وہ حسب فرمائش ہر وقت اُسی نمبر کا اُسی ڈزائن کا اور اُسی ٹو کا مضمون تیار کر سکتے ہیں جس کی فرمائش کی جائے لیکن ہمیشہ وہ مضمون دینے میں ''وعدہ وصل'' کی طرح ''فردائے قیامت'' سے کام لیتے ہیں' ایڈیٹر صاحبان کا یہ خیال ذرا غلط ہے۔ اس لیے کہ مضمون نگار بیچارے سب نہیں تو کم از کم ہم بیچارے بعض وقت اپنی حسب فرمائش مضمون لکھنے میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ کاغذ حاضر' قلم حاضر' دوات حاضر' تو دماغ غیر حاضر۔ اب دماغ حاضر ہوا تو کاغذ قلم دوات غیر حاضر' اور واقعی بنارسی باغ میں قلم دوات کاغذ کیسے حاضر ہو سکتے ہیں۔ اور گھر میں جہاں قلم دوات کاغذ وغیرہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا موجود ہوتا ہے وہاں دماغ اتفاق سے حاضر نہیں ہوتا غرض کہ اسی حاضر غائب کی گردان میں مضمون ملتوی رہتا ہے۔ اگر جمع حاضر ہے تو واحد غائب' اور اگر واحد حاضر ہے تو جمع غائب۔ لیکن اڈیٹر صاحب اس تاخیر سے سمجھتے ہیں کہ مضمون نگار صاحب ناز' نخرہ' غمزہ کر رہے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ ایک مضمون لکھنے کے لیے کتنی مرتبہ واحد حاضر اور جمع غائب کی گردان کرنا پڑتی ہے' اور اسکے علاوہ بہت سی اُفتادیں اور بھی ہیں جو انسان پر آئے دن نازل ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً اسی مضمون کا قصہ یہ ہوا کہ یکم ستمبر کو پہلا ارادہ کیا کہ مضمون لکھیں۔ دو تین منٹ تک غور کیا' اسی غور و فکر میں دماغ کہاں سے کہاں پہونچ گیا یاد آ گیا کہ لاحول ولاقوۃ' عرصہ ہوا کہ راز کا خط آیا تھا جواب نہیں دیا۔ پھر خیال آیا کہ جگر کے خط کا بھی جواب نہیں دیا ہے اور ہاں اس نے اناؤ بلایا تھا اچھا اب کی اتوار کو جائیں گے اتنے میں آ گیا دھوبی' اس سے پاجامہ کھونے کی شکایت' قمیض پھاڑنے کے شکوے' کالر پھولنے کے گِلے شروع ہو گئے۔ کھانے کا وقت آیا' وہ بھی ٹل گیا۔ ہاتھ دھو کر انگڑائی لیتے ہوئے ذرا آنکھ جھپکانے کو لیٹ رہے اور چار بجے کی خبر لی' اُٹھے غسل کیا اور آوارہ گردی کو نکل گئے۔ غرض کہ تمام دن اور تمام رات صرف کر کے دوسری ستمبر کو پھر علی الصباح مضمون کا خیال آیا۔ حافظ محمد عالم صاحب کی برہمی کا افسوس ہوا' خیال کیا کہ لاؤ فسانہ لکھیں' بس شروع کر دیا فسانہ ساتھ نام اللہ کے نام رکھا ''تریاہٹ'' اور فسانہ لکھنا شروع ہوا' ماشاءاللہ کوئی دس منٹ میں پہلا باب ختم کر ڈالا' اور قلم رکھ کے ذرا کمر سیدھی کی بس فسانہ ختم اب سوچا اچھا ذرا لیٹ کے نظم کہیں' مصرعہ عرض کیا۔

''چاند کی ٹھنڈی شعاعیں لرزہ براندام ہیں''

دوسرے مصرعہ کے الفاظ ذہین میں اچھی طرح آئے بھی نہ پائے تھے کہ اُنھوں نے شانہ ہلا کر کہا ''آج دفتر جاتا ہے یا نہیں؟ نو بجنے کو ہیں۔'' بس جناب شاعری

وغیرہ سب تشریف لی گئی، کپڑے پہنے، جلدی جلدی کھانا کھایا، چائے بہت گرم تھی اس کو یوں ہی چھوڑا اور ٹوپی پہنتے ہوئے یہ جاوہ جا دفتر پہونچ گئے۔ دفتر میں وہی روز کا چرچہ پانچ بجے گھر کو آئے تو دن بھر کے تھکے ہوئے تن بدن کا ہوش کہاں بس چاروں شانے چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں، وہ اللہ کی بندی پنکھا جھلا کی اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اب روز اسی طرح دفتر جاتے رہے، فسانہ کا ایک باب اور نظم کا ایک مصرعہ لکھا ہوا اب تک رکھا ہے اس کو پورا کون کرتا، ہم تو دفتر جاتے رہے اور دفتر سے آکر جو حال ہو جاتا ہے اس کو وہی مضمون نگار خوب سمجھ سکتے ہیں جو کسی روزانہ اخبار کے دفتر میں ہماری طرح نوکر ہوں۔ دن بھر سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں دماغ گاندھی کا چرخہ ہو جاتا ہے، پھر پیشی مضامین کس سے لکھے جائیں، مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ارادہ برابر کرتے رہے کہ اب کی کوئی تعطیل آئے تو مضمون یا نظم لکھ ہی ڈالیں گے۔ تعطیل کون سی آتی: اخبار اور تعطیل، دو ایسی تلواریں ہیں کہ ایک میان میں رہ ہی نہیں سکتیں، بہر حال خدا اتوار کو سلامت رکھے کہ ہفتہ بھر کا پروگرام اسی ایک دن پر ٹلتا ہے۔ نہانا، دھونا، کپڑے بدلنا، دوستوں اور عزیزوں سے ملنا، آنا جانا، مضمون لکھنا، غرض کہ سب کچھ اتوار کے دن کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں اور اتوار کو دن بھر صرف سوتے ہیں، لیکن اب کہ بالکل طے تھا کہ ''عالمگیر'' کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس ارداہ کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعہ کے دن بخار ہو گیا۔ ہفتہ کو ۱۰۳ تک پہونچ گیا اور اتوار کو تو ڈاکٹر صاحب کا موٹر گھر پر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نبض دیکھ رہے تھے۔ پیٹ دیکھ رہے تھے، سینہ ٹھوک بجا کر دیکھ رہے تھے، اور ہم ڈاکٹر صاحب کا مُنہ دیکھ دیکھ رہے تھے کہ دق تجویز نہ کردیں۔ مگر اُنھوں نے ملیریا فرمایا۔ نسخہ لکھا، فیس تو ہمارے یہاں لیتے نہیں ہیں، یوں ہی چلے گئے۔ نسخہ پیا یعنی نسخہ کی دوا ایسی کڑوی اور تیز کہ بجائے حلق میں اُترنے کے پہلے دماغ میں تشریف لے گئی، پھر تیر کی طرح حلق سے اُتر کر تمام گلے میں شگاف کرتی ہوئی معلوم نہیں پیٹ کے کس حصہ میں پہونچی، مگر تمام بدن میں آتش سیال کی طرح ایک سوزش پیدا کرگئی۔ اب تک اُس کا مزہ یاد کر کے تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوزخ میں شاید یہی پانی کی جگہ گنہگارں کو دی جائے گی۔ ہر تیسرے گھنٹہ کے بعد اس کی ایک خوارک سے تواضع ہوتی رہی، کمبخت نے پیٹ ایسا صاف کیا کہ صرف آنتوں کا برآمد کرنا چھوڑ دیا، اور وہاں ڈاکٹر صاحب نے مقاطعہ جوعی کا حکم بھی دے دیا۔ صرف دودھ جس سے مجھ کو ہمیشہ نفرت رہی ہے، استعمال کو فرمایا مگر بخار اس سے بھی نہ گیا بلکہ ۱۰۴ ہو گیا۔ اور آخر کار ۱۰۵ تک پارہ پہونچ گیا۔ اب تو ہم ذرا مرحوم ہونے کے تصور میں گھبرائے۔ وصیت شروع کی۔ در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی، کلمہ پڑھا اور سچے مسلمان کی طرح توبہ استغفار شروع کردی، ڈاکٹر صاحب پھر طلب کیے گئے اُنھوں نے پھر وہی نبض دیکھی قلب کی

حرکت کا معائنہ کیا، زبان دیکھی، آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور فرمایا کہ بخار ملیریا نہیں ٹائیفائڈ ہے چودہ دن کے بعد اُترے گا۔ نسخہ تبدیل کر دیا۔ دوا آئی، نہایت خوشرنگ ہلکا ہلکا نارنجی رنگ کاگ کے کھلتے ہی وہ بھینی بھینی خوشبو آئی کہ کہ دماغ معطر ہو گیا، لیکن جیسے ہی مُنہ میں پہونچی معلوم ہوا کہ تیزاب پی لیا زبان اینٹھ کر رہ گئی، حلق جکڑ گیا، تمام بدن میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو حواس ہی بجا نہ رہے، جب کُلی کی تو پتہ چلا کہ مزہ کیسا تھا کڑوا اور نمکین، کٹھا اور سیٹھا، سب یک جا۔ خدا اس دوا سے اپنے ہر بندے کو بچائے۔ ہم تو خیر بچے نہیں، لیکن ہمارے دوسرے برادران ملک وملت اس دوا سے محفوظ ہیں۔ ہمارا تو یہ حال ہوا کہ شاید ملک الموت روح قبض کرنا بھول جاتے مگر ہماری تیمادار صاحبہ دوا کا وقت نہیں بھولتی تھیں، جہاں پہلی خوراک کو تین گھنٹہ ہوئے اور وہ اپنے ایک ہاتھ میں دوا کی شیشی اور دوسرے میں فیڈنگ کپ اور پاب لیے سر پر موجود، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے دوا کے اُن کی صورت سے متلی ہونے لگی۔ بخار ایسی تکلیف دہ چیز نہیں ہے اُسمیں تو تھوڑا سا لطف بھی آتا ہے۔ بشرط یہ کہ سر میں درد نہ ہو، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب ذرا زیادہ پی لی ہے۔ لیکن یہ دوا تمام نشہ ہرن کر دیتی ہے اول تو صرف کنین ہی کیا کم ہے اُس پر سے اور نہیں معلوم کیا کیا خرافات ملا کر اس کو مکمل زہر بنا دیا جاتا ہے۔ مُنہ کا مزہ مستقل طور پر کڑوا کر دینے والا میری رائے میں بخار نہیں ہوتا بلکہ یہ دوائیں ہوتی ہیں

اور پھر معالج صاحب کس انداز سے پوچھتے ہیں ''مُنہ کا مزہ کیسا ہے؟'' جی چاہتا ہے کہ دوا کی ایک خوراک پلا کر کہے کہ ''ایسا ہے''۔ روز ڈاکٹر صاحب کو حال لکھوا کر بھجوا رہے ہیں کہ شاید دوا بدلیں، لیکن جواب یہی ملتا ہے ''دوا بدستور، غذا بند۔ اور یہ پوڈر صبح وشام پانی سے پیا جائے''۔ لیجیے دوا تو تھی ہی ایک پوڈر کا بھی اضافہ ہو گیا، یعنی گئے تھے نماز بخشوانے، روزے بھی ساتھ ہو لیے۔ خیر پوڈر تو ایسی چیز نہیں ہے جسکا اثر دیر پا ہو۔ ایک آدھ جُھر جُھری کے بعد جہاں پان کھایا پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ پوڈر بھی کھایا تھا یا نہیں، لیکن دوا تو سوتے ہوئے بلکہ مرے ہوئے آدمی جا کر چھڑک دی جائے تو گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہو، اور اگر زندہ کو پلا دی جائے تو ہوائی جہاز بن کر اُڑ جائے لیکن ہم ایسے سخت جان ہیں کہ دن میں تین مرتبہ پیتے ہیں اور دو تین مرتبہ منہ بنا کر ہاتھ پیر اِدھر اُدھر مار کر رہ جاتے ہیں لیکن نہ بخار کم ہوتا ہے نہ دوا چھوٹتی ہے۔ بخار کو دس دن ہوئے مگر کم نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے فرمان کے مطابق گویا چار دن کی مصیبت اور تھی لیکن گیارھویں دن بخار کم ہوا۔ تھرمامیٹر کا پارہ خلاف عادت صرف ایک سو دو تک چڑھ کر رہ گیا، لیکن نہیں معلوم یہ کیا بات ہے کہ بخار کے کم ہونے سے ایک تو کمزوری کا احساس زیادہ ہوتا ہے، دوسرے غصہ زیادہ آتا ہے۔ لہذا آج کمزوری زیادہ محسوس ہوئی اور بات بات پر غصہ آیا۔ سب سے زیادہ غصہ تو دوا کے اوقات پر آیا دو اپنے پر تو از روئے قاعد غصہ نہیں کر سکتے تھے لہذا اپان چھوٹا

ہونے پر، بستر پر شکن پڑنے پر، ناک پر مکھی بیٹھنے پر، بچوں کے زور سے چلّے پر باری باری غصہ کر رہے، اتنے میں کسی نے کہدیا کہ نل میں اب تک پانی نہیں آیا ہے۔ بس ہم نے مینوسپلٹی پر، چیرمین پر، واٹر ورکس پر غصہ شروع کیا۔ پانی آ گیا تو نل بند کرنے پر غصہ کیا، نل بند ہوا تو بوندیں ٹپکنے پر غصہ کیا، غصہ کہ بات مل گئی اُس پر غصہ کر لیا۔ حالانکہ کمزوری کی وجہ سے آواز نہیں نکلتی تھی لیکن پھر بھی غصہ کمزور آواز کو شاندار بنا دیتا تھا۔ لہذا ہم گھر بھر کو سر پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ جب ہم نے غصہ کی حد کر دی تو اُنھوں نے مجبور ہو کر کہا ''اچھا بس ہو چکا غصہ، چپکے پڑے رہو'' ہم کروٹ لے کر چُپ ہو رہے، اب جو تھرما میٹر لگایا گیا تو بخار وہی ایک سو تین تھا۔ سب نے کہا غصہ سے بڑھا لیا، کسی نے کہا کمزور تو ہو رہے ہیں اتنا بکے کہ بخار بڑھ گیا۔ یہ کسی نے نہ کہا کہ ابھی دوا پی ہے دوا سے بڑھ گیا ہوگا۔ ایک سو تین بخار کے ہونے سے ہم پر وہی سابقہ کیفیت طاری ہوگئی کہ خاموش پڑے ہوئے اچھے ہو جانے کے بعد کی بد پرہزیوں کا تصور کر کے دل خوش کرنے لگے کہ کوئی دعوت انشاء اللہ ناغہ نہ کرینگے بلکہ ان دوستوں کے یہاں ضرور جائیں گے جہاں پُر تکلف چائے سے تواضع ہو، اُس کے ساتھ میٹھائیاں ہوں اور جب اچھے ہو جائیں گے تو لاہور جائینگے۔ حافظ محمد عالم صاحب دعوت ضرور کرینگے اور دوست بھی دعوت دینگے، اتنی طویل علالت کا کفارہ ہو جائیگا۔ یہی غور کرتے کرتے غنودگی طاری ہوئی۔ معلوم نہیں خواب میں کیا کیا دیکھا کہ ایک دم سے اُچھل پڑے۔ آنکھ کُھلی تو دوا کا وقت تھا۔ فرشتہ دوا لیے کھڑا تھا ''پی دوا'' پیتے نہ تو کہاں جاتے، زمین سخت اور آسماں دُور۔ غرض کہ اسی طرح دو دن اور کٹے۔ چودھویں دن صبح کو بخار نارمل تھا۔ بہت خوش ہوئے۔ آج صبح دودھ کے ساتھ ایک ٹوسٹ بھی ملا لیکن غالباً اتنے دنوں تک مقاطعہ جوعی کرنے کے بعد آنتیں خشک ہوگئی تھیں، ٹوسٹ کی طرف کچھ رغبت نہیں ہوئی۔ بہر حال کھایا اور رزاق مطلق کا شکر ادا کیا، ڈاکٹر صاحب کو خوشخبری لکھی، لیکن اس کے جواب میں بھی ''دوا بدستور'' حکم آیا۔ صبر کر کے رہ گئے۔ اس لیے کہ اب تو زیادہ سے زیادہ دو ایک دن کی بات اور تھی، پھر ہم کو کون دوا پلاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہوں یا ہماری تیماردارنی ہم کس کے ہاتھ آنے والے ہیں۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ خوشامد کرتے ہیں، باتیں بناتے ہیں مگر پھر بھی دوا پینا پڑتی ہے۔ وہ دوا لائیں اور ہم نے خوشامد شروع کی کہ آپ کے رسالہ ''سہیلی'' کا دفتر بھی لاہور آ گیا ہے، اُنھوں نے جواب دیا کہ معلوم ہے دوا پیجے''۔ لیجیے ہم نے تو اُن کی دلچسپی کی بات کہی تھی اُنھوں نے ٹکا سا جواب دیا کہ ''معلوم ہے دوا پیجے''۔ یہ بھی کوئی انسانیت ہے؟ مگر کیا کریں سب کچھ سہنا پڑتا ہے، بخار نارمل ہوا مگر کمزوری بڑھ گئی۔ نقل و حرکت سے معذور، بستر پر پڑے ایک ایک کا مُنہ دیکھ رہے ہیں۔ اچھے ادیب ہیں، اچھے شاعر ہیں، اچھے اسسٹنٹ اڈیٹر روزنامہ ''ہمدم'' ہیں کہ نہ اُٹھنے کے نہ بیٹھنے کے، پندرھویں

آپ بیتیاں

دن مونگ کی دال کی پتلی کھچڑی کھانے کو ملی، کھچڑی کھائی بہت ذرا سی مگر آنکھیں کھل گئیں۔ سب سے پہلے مضمون کا خیال پھر حافظ محمد عالم صاحب کا خیال پھر ''عالمگیر'' کے خاص نمبر کا خیال بائسکوپ کی فلم کی طرح ذہن میں آئے مگر اُٹھ ہی نہ سکے۔ شام تک متواتر ارادے کرنے سے دیوار کے سہارے تھوڑی دور اُس بچے کی طرح چلے جو چلنا سیکھ رہا ہو لیکن شکر ہے کہ اس کی طرح گرے نہیں، اور واپسی تو دو آدمیوں کے سہارے سے ہوئی۔ آج سترھواں دن ہے، تو ہم نے جس طرح بھی ہوا لیٹے لیٹے یہ سطریں لکھ ڈالیں۔ اب قلم رکھ کے جو آنکھیں بند کر کے لیٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ آنجہانی ہو گئے۔ اس لیے کہ کافی خستگی ہو چکی ہے مگر حافظ محمد عالم صاحب تو ہم کو سمجھے ہوئے ہیں مضمون نگار۔ اُن کو کیا معلوم کہ مضمون نگار ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر دراز بھی ہو سکتے ہیں، اُن کے ڈر کے مارے جو کچھ لکھا جا سکا ہے لکھا ہے، مگر یہ یاد کرانے کی آخری کوشش کرتا ہوں کہ کم ستمبر کا ارادہ جو اتفاق سے بغیر انشاء اللہ کے کیا تھا ابھی فسانہ کے ایک باب اور نظم کے ایک مصرعہ کی صورت میں بکس میں بجنسہ موجود ہے جو انشاء اللہ ہاں اب کی انشاء اللہ کہہ دیا معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے تو انشاء اللہ وہ باب اور وہ مصرعہ آئندہ سالانہ نمبر کے لیے کام آئے گا۔ خاص نمبر کے لیے یہ لیجیے۔

☆☆☆

یادرفتگاں

## اپنے آپ پر بھروسہ کرو

کسی باغ میں ایک کبوتر نے اپنا آشیانہ بنایا ہوا تھا۔ جس میں وہ دن بھر اپنے بچوں کو دانہ چگاتا۔ بچوں کے بال و پر نکل رہے تھے۔ ایک دن کبوتر دانہ چوگنے میں دبائے باہر سے آیا تو سارے بچوں نے انہیں تشویش سے بتایا کہ اب ہمارے آشیانے کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔ آج باغ کا مالک اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ ''پھل توڑنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ کل میں اپنے دوستوں کو ساتھ لاؤں گا اور ان سے پھل توڑنے کا کام لوں گا۔ خود میں اپنے بازو کی خرابی کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکوں گا۔'' کبوتر نے اپنے بچوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''باغ کا مالک کل اپنے دوستوں کے ساتھ نہیں آئے گا۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔'' اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔ باغ کا مالک دوسرے روز اپنے دوستوں کے ہمراہ پھل توڑنے نہ آیا۔ کئی روز بعد باغ کا مالک اپنے بیٹے کے ساتھ باغ میں آیا اور کہنے لگا۔ ''میں اس دن پھل توڑنے نہ آ سکا کیونکہ میرے دوست وعدے کے باوجود نہ آئے لیکن میرے دوبارہ کہنے پر انہوں نے پکا وعدہ کیا ہے کہ کل وہ ضرور آئیں گے اور پھل توڑنے باغ میں جائیں گے۔'' کبوتر نے یہ بات بچوں کی زبانی سن کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، باغ کا مالک اب بھی پھل توڑنے نہیں آئے گا۔ یہ کل بھی گزر جائے گی۔'' اسی طرح دو سرا روز بھی گزر گیا اور باغ کا مالک اور اس کے دوست باغ نہ آئے۔ آخر ایک روز باغ کا مالک اپنے بیٹے کے ساتھ پھر باغ میں آیا اور بولا۔ ''میرے دوست تو بس نام کے ہمدرد ہیں۔ ہر بار وعدہ کر کے بھی ٹال مٹول کرتے ہیں اور نہیں آتے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنا کام میں خود کروں گا اور کل باغ سے پھل توڑوں گا۔'' کبوتر نے یہ بات سن کر پریشانی سے کہا۔ ''بچو! اب ہمیں اپنا ٹھکانہ کہیں اور تلاش کرنا چاہیے۔ باغ کا مالک کل یہاں ضرور آئے گا کیونکہ اس نے دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

حاصل کلام: دوسروں پر بھروسہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ (حکایات سعدی)

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

# یارِ غمگسار کی بات' (مخدوم محی الدین شخص اور شاعر)

تاریخ کا ہر دور' ہر عہد اس میں رہنے بسنے والوں کے لیے دعوت غور و فکر دیتا ہے آج جبکہ ہر راگ نیا' ہر لے نئی ہر ادا نرالی ہر آواز جُدا افسردہ اور کہنہ روایات کی آہنی زنجیریں توڑ چکی ہیں' زمانے کا اقتضاء ہی بدل چکا ہے اس آئی ٹی' خلائی مہمات اور اقتدار کے دور نے چاند تاروں پر انسانی عقل و فراست اس کی حکومت کی کمندیں پھینکیں' ان کو مسخر کرلیا اور اپنی بساط سے بھی سوا کرنے لگا ہے لیکن زندگی کی مختلف جہتوں اس کی الجھنوں اور مسائل سے گلو خلاصی نہ پا سکا اس طوفانی کشمکش کے چنگل سے باہر نہ نکل سکا جس نے اس کو تسکین آسودگی لذت اندوزی سے دور رکھا تاہم حیات و ممات کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے حوصلے سے آگاہ و باخبر ادیب و شاعر فنکاروں نے زندگی کی تمام کیفیات تمام تر تقاضوں کو ہر' ہر زاویے سے اپنی تخلیقی صلاحتیوں سے زیر نگیں کرلیا اور بعنوان ادب' شاعری و نثر نگاری انسان کو جینے کا سلیقہ و شعار بخشا۔ خصوصیت سے شاعری کو باب حسن و عشق' گل و بلبل' بادہ و ساغر' شمع و پروانہ' ہجر و وصال اور ایسے ہی جذبات کے ساتھ ساتھ مقفی و مسجع عبارت آرائی مبالغہ طمطراقی کی دنیا سے نکال کر اصل حیات سے دوچار کیا بلکہ زیست کی سب سے بڑی مجتہد بن گئی۔ آج کا شاعر نباض وقت' دیدہ بیدار' حساس غم و خوشی کا وقف کار' تضاد فکری نظری سے آگاہ' اپنے مشاہدات کی سچائی کا نقیب جذبات و تجربات کا عکاس اس کا ترجمان ہے۔ وہ اپنی تخلیق کی صورت سے اطراف و اکناف ہی نہیں اپنے اندر بھی جھانکتا ہے' ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے' شگفتگی' تلخی' آسودگی و شوریدگی کا ذمہ دار ہے۔ حالات و واقعات کا آئینہ دکھاتا ہے۔ یوں تو اس کو ہر علم سے سروکار رہے' ہر فن سے ربط و تعلق' ہر حادثہ اور ہر واقعہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ہر کارِ حیات میں پوشیدہ و پنہاں نشاط و رنج کی طلب سے علاقہ اس کا وصفِ مزید ہے۔ اب آپ اسے کسی اور حسین اصطلاح یا معنی خیز لفظ سے وابستہ کرلیں ہر صورت یہ ماننا پڑے گا کہ الفاظ کا یہ جادوگر محض لفاظی نہیں کرتا مرصع سازی کے جوہر نہیں دکھاتا بلکہ بہترین خیالات کی ترسیل سے ذہن و دل کو راست متاثر کرتا ہے بلکہ محض حُسن طریق و شائستگی خیال سے ایسے شعر کہتا ہے کہ ایک عالم اس کی طباعی فہم و تدبیر پر عش عش کرے۔ شعر کے ذریعے وہ ایک ایسا ساز چھیڑتا ہے جس میں نفس انسانی کو مرتعش کرنے کیلئے ہر تار موجود ہے اور اس کو بجانے والا وہ مغنّی ہے جو صدیوں سے انسانی قلوب کی تمناؤں آرزوؤں' مسرتوں' شادمانیوں اور محرومیوں کا مَحرم ہونے کے سبب محترم و محبوب رہا ہے ایسے ہی مرد آگاہ شاعروں میں ایک شاعر تھا نبض شناس عصر' مخدومؔ محی الدین۔

مخدومؔ محی الدین ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمگیر سطح کا وہ ہر دل عزیز انقلابی شاعر ہے جس نے اپنی انفرادیت اور اختصاص کو ابتداء ہی سے بنائے رکھا' مخدومؔ کی شاعری کا تاثر انوکھا دلچسپ جدت و ندرت سے مملو' غیر معمولی جذباتی ہے' مخدومؔ دکن کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے روایتی بندھنوں کو توڑ دیا اور ایک الگ راہ اپنائی۔ اس نئی ڈگر سے اپنی نغمگی کا آغاز کیا جس میں شعریت کا لوچ' زندگی کا درد' غربت و امارت کا تفاوت صاف پڑھا جاسکتا تھا۔ اسی کے ذریعے اسے شہرت دوام ملی۔ یہ سعی و کاوش' خود اس کے ہمعصروں کے لئے بھی مقام حیرت کا موجب بنی۔ اس نے حیات امروز کی ڈھڑکنوں کو اپنے بربط دل پر مضراب کی صورت میں محسوس کیا' مخدومؔ نے شاعری کے اُس پہلو یعنی تفنن خوش طبعی کو مسائل حیات کی آبیاری سے بدل دیا' انہوں نے زمانے کے بدلتے رجحانات کو نظر میں رکھتے ہوئے نئے نئے تقاضوں کے آئینہ میں اپنے فطری جوش و خروش کو مختلف انداز و طریق سے اجاگر کیا۔ ایک حساس' بیدار مغز' دوررس نتائج کے حامل انسان ہونے کے ساتھ وہ مختلف ہستیوں میں ایک خاص شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مقناطیسی طبیعت کا پرتو ہر جگہ ہر مقام پر نمایاں و ممتاز رہا' وہ کبھی کالج کے لکچرر' کبھی ٹریڈ یونین کے لیڈر' کبھی مجاہد آزادی' کبھی قانون ساز کونسل کے ممبر' ایک جی دار مضبوط صاحب عزم قائد تحریک' مخلص دوست کے علاوہ ایک مزاج دانِ رنگ و آہنگ شاعر بھی تھے اور یہ تمام ہمہ جہتی ہر سطح ذہن کو متاثر کرتی تھی۔

ایک جھونکا ترے پہلو کا سہکتی ہوئی یاد
ایک لمحہ تری رواداری کا کیا کیا نہ بنا

مخدومؔ محی الدین کی شاعری کا ابتدائی دور روایتوں کا پابند اقدار و اصولوں کا شائق، رنگینیٔ مزاج کا خوگر، پستی و بلندی، نشیب و فراز، سرد و گرم ہے، عبارت ہے لیکن یہ طلسم لفظ و معنی بہت جلد ٹوٹ گیا، کہنگی و فرسودہ خیالی کا جادو، حقائق کی روشنی، ظلمت کی پردہ دری سے ختم ہوا، زمانے میں نظریاتی تصادم، طبقاتی کشمکش، رجعت پسندی، اشتراکیت، سامراجیت عامرانہ طور طریق کے بت، نہ جانے کتنے صنم خانوں میں سجائے گے اور ان کی پرستش ہونے لگی تھی۔ ایسے میں بھلا مخدومؔ کی سیمابی فطرت کیسے خاموش رہتی؟ مخدومؔ آزادی کے اُن تہواروں کی آواز میں آواز ملانے لگے، اُن کے شانہ بہ شانہ چلنے کو اپنا نصب العین بنالیا جنہوں نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا تھا، اپنی اس شاعری کی ابتدا انہوں نے ''اندھیرا'' سے کی۔ بقول علی سردار جعفری ''اندھیرا'' مخدومؔ کی شاعری کا صحیح موڑ ہے:۔

رات کے ماتھے پہ آرزدہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

اسی کیف و سرود، اسی ترنگ میں مخدومؔ نے جنگ آزادی، زلف چلیپا، سپاہی جیسی نظمیں لکھیں۔ نظم سپاہی کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس میں افسردگی افتادگی کے سوا کچھ نہیں مگر یہ سچ نہیں۔ شاعری ''سرخ سویرا'' نے جس حوصلہ و عزم نیز غم و اندوہ سے اس کی عکاسی کی ہے وہ بجائے خود انوکھی و غیر معمولی ہے۔

لاش جلنے کی بو آرہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے ملتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جارہا ہے

شاعر کا تلخ و تندلب و لہجہ، اداسی حرماں نصیبی سے کہیں زیادہ جانکاہ منظر دل دوز واقعہ جذباتِ شدید سے آگاہ کرتا ہے۔ الفاظ کا ادارک کہانت اور روایت سے دور، سرگذشت آدم اس طرح بیان ہو رہی ہے کہ شاعری کی تمام ''مرفوقیت اس کی لفظی و معنی دلکشی ایک نقطہ میں سمٹ گئی، یقیناً یہ انسانیت کا وہ المیہ ہے اسے سرمایہ بیش بہا کہا جائے تو غلط نہیں۔ مخدومؔ کا یہ طرز فکر، روش، انداز بیان، زیادہ پسندیدہ نہیں رہا لیکن ان کی شاعری کے یہ خد و خال رفتہ رفتہ زمانے کے واقعات سے ہم آہنگ ہونے لگے اور پھر جو مقبولیت مخدومؔ کے حصہ میں آئی وہ ان کے ہمعصروں کو شاذ ہی حاصل ہوسکی۔ ''سرخ سویرا'' کی اشاعت کے بعد مخدومؔ کا شماز نئے ادب کے معماروں میں کیا جانے لگا انہوں نے بانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ''عوام کا احترام کرو'' ظالم اور صاحب اقتدار حکمراں طبقے نے انہیں اس سلسلے میں شب و ستم سے دوچار کیا۔

مخدومؔ محی الدین فطرتاً ایک مہم جو، فعال، باصلاحیت پر جوش انسان تھے انہوں نے حیدرآباد کے نوجواں طبقے کو جدید ادب کے تقاضوں سے نہ صرف روشناس کیا بلکہ انقلاب برپا کیا، انہوں نے شعر و سخن ہی نہیں بلکہ محنت کش افراد کی بھی نمائندگی کی، شاعروں کو تصنع، بناوٹ، ریاکاری، مشکل پسندی، فصیح و بلیغ مغلق استعاراتی زبان و بیان کے استعمال سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا سیدھا سادہ طرز

یادِ رفتگاں

اظہار عام فہم طور طریقہ عوام پسند ہو گیا' مخدوم کا یہ رنگ و آہنگ بر لطی لہجہ' غنائی کیفیت' موسیقیت دلوں کو چھو لینے والا مزاج بن گیا۔ یہ اچھوتا اور شاندار ڈھنگ اسلوب ان کے کلام میں ابتداء تا انتہا محیط دکھائی دیتا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے دیگر شاعروں جیسے مجاز' جذبی' جعفری' فیضی سے کچھ آگے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے لہجے میں دردمندی رواداری اپنایت جھلکتی ہے۔ اشتراکی نظام سے وابستگی کے بعد مخدوم کا شعری شعور اور وسیع النظر ہو گیا۔ اس کا آفاقی تناظر و مانیت کے مزاج و مرتبہ سے نئی آگاہی نئی زندگی سے واقفیت دلاتا ہے۔

جہل فاقہ بھوک بیماری نجاست کا مکاں
زندگی کی تازگی عقل و فراسیت کا مکاں

اس جوش و ولولے سے وہ ایک نئی سحر نئی امنگ نئے ارادہ اور نئے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا' نیا آدم بنایا جائے گا

پھر ان کا یہ پیغام آج بھی اپنی مکمل معنویت منفرد فکر قوتِ عمل کا آئینہ دار ہے کہ انسانیت کے اس عظیم کاروانِ تگ و دو میں اتحاد و اعتماد ہی سب سے بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے وقت کے دھارے بدلے جا سکتے ہیں۔ مخدوم کا یہ شعر اس خیال کی تفسیر سے جدا نہیں بلکہ ضرب المثل بن گیا۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

ooo

اس انقلابی صدائے لازوال کے ساتھ وہ غریبوں اور محنت کشوں کی پشت پناہی کرتے ہیں:

یہ کس غریب کے سینے سے ہو ک اٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل' تھرتھرا رہا ہے قمر

مخدوم جاگیر دارانہ نظام یا سرمایہ پرستی کے سخت مخالف تھے۔ وہ اس طرز حیات پر بھرپور وار کرتے ہیں:

آپ تن آسان راج دُلارے
میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا عہد مسلسل!
آپ کی دنیا سیل خموش

مخدوم نے اپنی سحر انگیز بے مثال شاعرانہ خلاقی 'انسان دوستی سے جذبات انسانی کی شرح کی ہے۔ چنانچہ خود انہوں نے ایک جگہ لکھا:

''شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے۔ یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے۔ شاعر نے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا ہے اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و ملمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں' شاعر بحیثیت ایک فرد معاشرہ حقیقتوں سے متصادم رہتا ہے' پھر وہ دل کی جذباتی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے' شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تا کہ نوع انسانی سے قریب ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال زوال یافتہ ادیب ''انا''

اور انفرادیت سے تعبیر کرتا ہے۔ شعر میں ہم ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا''۔

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مخدوم کے کلام میں گہرائی گیرائی بدرجہ اتم موجود ہے لیکن ہمارے بعض اہل علم مخدوم کی شاعری کے اسی ایک پہلو پر زور دیتے ہیں یا پھر ان کے کلام کو محض انقلاب آفریں شاعری کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ ان کے ہاں جمالیاتی' بانکپن سوز وگداز نازک جذبات حساس دل کی کیفیات کی فراوانی بھی ملے گی۔ ان کے مزاج میں جہاں سیمابی زیروبم ہے محبت اور چاہت کی خوبصورتی صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ انقلابی وصف کے ساتھ ساتھ شاعرانہ رنگ وآہنگ' دلکشی' رعنائی لفظیات کی صلابت وسادگی متاثر کن ہے اور یہی مخدوم کی شاعری کا خاصہ بھی ہے۔ شاعری پابند ہو یا آزاد ان کا لب ولہجہ ہمیشہ چونکا دینے والا بلکہ قلب وذہن پر چھا جانے والا ہوتا۔ ان کی نظمیں ''چاند تاروں کا بن'' ''دھنک'' ''وصال'' اور لختِ جگر'' اپنی تاثیر وموسقیت موضوع کی وسعت کے علاوہ اختصار وجامعیت کا ایک وقار وتمکنت بنائے ہوئے ہے۔ ان نظموں کے قطع نظر مخدوم کی وہ شاعری جو جمالیاتی جولانیوں سے بھرپور برجستہ وغنائی لحاظ سے معمور ہے۔ اہل ذوق وشوق کے لئے نعمت سے جدا نہیں۔ گویا تسکین آسودگی لذت درد کسک کا ادراک مائل بہ التفات ہے۔

آگہی تھی دل مضطر میں' شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی
رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

مخدوم کی شاعری میں محبت کا پاکیزہ جذبہ اور اس کا تصور صاف جھلکتا ہے۔ وہ کبھی اپنے محبوب سے یہ نہیں کہتے کہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' بلکہ وہ اپنے آپ کو محبوب سے جدا نہیں پاتے۔ ان کا یہ انداز فکر اس کا بے ساختہ پن دیکھئے۔

وہ خمِ گردن دوست ناز وہ اُن کا کلام
ابروؤں کا نظم وہ نگاہوں کا پیام
بولتی آنکھوں کا اس گل رنگ کے عارض کا حال
مسکراتا سا تصور گنگناتا سا خیال

اور مخدوم اسی فضاء میں کھوئے جاتے ہیں۔ اُن کی اس شاعری کے بارے میں ایک نقاد کا کہنا ہے۔

''مخدوم کے ہاں یاد ماضی کی تلخی نہیں جھلکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اُن محبت کی تحریکوں سے خوش ہے مطمئن زندگی کی ان وارداتوں سے نفرت کرتا ہے اور نہ شرمندہ ہے۔ ان کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ اکثر اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے۔ گویا وہ اس کے روبرو ہو''۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں اُن کی جوانی ساتھ ہے

مخدوم نے شاعری کے تلازموں کو بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے جیسے ہجر وفراق' اسے لگتا ہے کہ وہ اس کیفیت سے سرشار ہیں وہ جدائی محسوس کرتے ہیں درد والم سے باخبر ہیں۔ اس کیفیت کی ادائیگی پر نظر ڈالیے:

نہ اب وہ کیفیت باقی ہے نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

یادرفتگاں

اور جب جی بھر آتا ہے یاد کے کچو کے اندوگیں کر جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلیاں دیتے ہیں:

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی
دل میں اژدھام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
خدا بھی مسکرادیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

عشق ومحبت کا یہ انوکھا اثر نرالی حالت' قاضی عبدالغفار نے یہ شعر کسی مشاعرہ میں سنا تو کہا'' خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جس کا خدا بھی اتنا ہی مشفق ومہربان ہے کہ محبت کے اس مظاہرہ پر خوش ہوتا ہے''

عبارت مختصر! مخدوم کی شخصیت اور شاعری نئی جہت نئی روشنی نئی آگہی نئی حیات سے عبارت ہے۔ ان کے خیالات مشاہدات کی پختگی کے ہمراہ دل ونگاہ کو لطف سے ہمکنار کرتے ہیں۔ وہ شاعری میں تہذیب نفس اور اخلاص بے پایاں کو سمونے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تصنع' بناوٹ' خوشامد تملق نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی ۔ وہ آدمی کو بربریت' انسانیت سوز حرکات' حرص وآز کے برخلاف محبت' پاس داری' رواداری ویکجہتی کا درس دیتے ہیں۔ شاعری کی وساطت سے مخدوم نے ایک پورے عہد کو متاثر کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے تین نسلوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اپنے بزرگوں (شعراء ادبا) اپنے دور کے افراد اور اپنی آئندہ نسل کو راست محنت ومحبت سے آشنا کر دیا اور ایک خوش آئند مستقبل کا ارزومند بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ رُوح کی نشاط انگریز رعنائیاں کیف وسرور کی پروائیاں' واقعات اور حادثات کی سچائیاں مخدوم کے کلام میں قدم قدم پر اپنا اثر ونفوذ بنائے رکھتا ہے اور شاید خود مخدوم کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ:

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
ابھی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

☆☆☆

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد' موبائل:9000289189

## سیاہ گوش اور شیر

سیاہ گوش سے لوگوں نے پوچھا۔'' تجھے شیر کا ساتھ کیوں پسند آیا۔''

سیاہ گوش نے جواب میں کہا۔'' وہ اس لیے کہ میں اس کا بچا کھچا بھی کھالیتا ہوں اور دشمنوں کے شر سے بھی بچا رہتا ہوں کہ شیر کے دبدبے اور خوف سے کوئی میرے نزدیک نہیں آتا۔ شیر کی پناہ میں زندگی بڑے مزے سے گزرتی ہے۔''

پوچھا گیا۔'' پھر کیا وجہ ہے کہ تو اس کی مہربانیوں کے اقرار کے باوجود بھی اس کے زیادہ نزدیک نہیں جاتا۔''

سیاہ گوش نے جواب دیا۔'' دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے دور رہوں اور محفوظ رہوں۔ ہوسکتا ہے کہ شیر کا مزاج کسی وقت بگڑ جائے اور وہ مجھے اپنا لقمہ بنالے۔ اس لیے فاصلے پر رہنا ہی بہتر ہے۔''

حاصل کلام: دانش مندی سے انسان ہزار ہا مصیبتوں سے بچا رہتا ہے۔ (حکایات سعدی)

# مکرم جاہ بہادر
## شخصیت، حیات اور خدمات



ہزا یگزالٹیڈ ہائی نیس والا شان نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر نظام ہشتم آصف جاہ (پیدائش: 6 اکتوبر 1933، نیس، فرانس۔ وفات: 14 جنوری 2023 استنبول، ترکی) کی زندگی ہی میں جناب شاہد حسین زبیری نے ان پر 320 صفحات کی سوانحی کتاب لکھی، جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ شخصیت راجکماری اندرا دیوی دھنراج گیرجی کے بقول 'شاہد حسین زبیری کا تعلق والا شان نواب مکرم جاہ بہادر سے قریب نصف صدی سے رہا ہے۔ انہوں نے جتنے قریب سے موجودہ نظام کو دیکھا، شاید ہی کسی اور نے دیکھا ہو۔ اس دوران وہ ایچ ای ایچ نظام ہشتم کے مختار کل (GPA) اور چیئر مین نظامس پرائیویٹ اسٹیٹ بھی رہے۔ شاہد حسین صاحب سے مکرم جاہ بہادر کے انتقال کے دودن بعد 16 جنوری 2023 کو لیے گئے انٹریو کے چند اقتباسات پیش ہیں:

**سوال:** مکرم جاہ بہادر کی پیدائش اور بچپن کے حالات کا پس منظر کیا تھا؟

**جواب:** اس پس منظر سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مکرم جاہ بہادر کے والد اعظم جاہ بہادر ہزا یگزالٹیڈ ہائی نیس پرنس آف برار کی شادی خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی کی دختر شہزادی دُرِّشہوار سے ہوئی تھی۔ اصل میں اس شادی کا پروپوزل مہاتما گاندھی کا تھا۔ یہ ایک سیاسی شادی تھی، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ہندوستان میں تحریک خلافت چلا رہے تھے۔ جس کی پرزور وکالت اور تائید مہاتما گاندھی کررہے تھے۔ مہاتما گاندھی نے شادی کا پروپوزل مولانا محمد علی جوہر کو دیا کہ وہ خلافت عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی تک پہنچائیں۔ اس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ اگر اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خان کے فرزند کی شادی، سلطان عبدالمجید ثانی کی دختر سے ہوجاتی اور ان سے جو اولاد پیدا ہوگی تو وہ سلطان عبدالمجید ثانی کا نواسہ ہوگا اور وہ دنیا کے سب سے رئیس حکمران کا پوتا ہوگا۔ اگر انھیں جانشین نامزد کردیا گیا تو خلافت ترکی سے منتقل ہوکر حیدرآباد سے برقرار رہتی۔ یہ اس شادی کا اصل مقصد و منشا تھا۔ خود حضور نظام میر عثمان علی خان کے پوری مسلم دنیا پر بڑے احسانات تھے۔ اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مولانا محمد علی کے چھوٹے بھائی مولانا شوکت علی خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی کے یہاں یہ رشتہ لے کر پہنچے تھے۔ وہاں یہ رشتہ طئے ہوا۔ اس موقع پر خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی نے یہ تحریر لکھی کہ میری بیٹی کے بطن سے اگر اولاد نرینہ پیدا ہو تو وہ میرا جانشین ہوگا۔ یوں یہ شادی فرانس کے شہر نیس میں ہوئی۔

**سوال:** درشہوار اور اعظم جاہ بہادر کی فرانس میں شادی ہونے کی

کیا وجہ تھی؟

**جواب:** ترکی میں فوج کی طرف سے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا، جس کی وجہ سے عثمانی خلیفہ کے شاہی افراد فرانس میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسی لیے شادی وہیں ہوئی۔

**سوال:** مکرم جاہ بہادر کا بچپن کس طرح گزرا؟

**جواب:** مکرم جاہ بہادر کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مشہور مدرسہ عالیہ میں ہوئی۔ پولا رام میں آصف جاہی کوٹھی میں ایک خاص اسکول کھولا گیا تھا، وہاں ان کی تعلیم ہوئی، پھر ڈون اسکول میں پہنچے۔ مکرم جاہ بہادر کے سلسلے میں شہزادی دُرِّ شہوار کے ذہن میں بہت واضح تھا کہ انھیں کسی قسم کے القاب سے نہ پکارا جائے بلکہ انھیں ان کے نام 'برکت' سے یاد کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مکرم جاہ بہادر کے بچپن کے دوست انھیں برکت کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ آپ کو دنیا کے مشہور اسکول ہیرون بھجا گیا، کیمبرج اور لندن اسکول آف اکنامکس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، وہیں ملٹری اکیڈیمی سنڈرس میں بھی تعلیم ہوئی۔ اکثر چھٹیوں میں حیدرآباد آنا جانا ہوتا تھا۔ بعد کے زمانے میں وہ جب بھی حیدرآباد آتے تھے تو پندرہ دن گھر میں اور باقی کے دن سابق وزیراعظم پنڈت جواہر نہرو کے مہمان ہوتے تھے۔ پنڈت جواہر نہرو، مکرم جاہ بہادر کو بہت چاہتے تھے۔

**سوال:** آصف سابع نواب میر عثمان علی خان نے اپنے فرزند اعظم جاہ دامت والاشان شہزادہ نواب میر حمایت علی خان کے بجائے پوتے آصف جاہ ثامن نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کو کیوں اپنا جانشین مقرر کیا؟

**جواب:** اس کا جواب خود آصف سابع نواب میر عثمان علی خان بہتر دے سکتے تھے۔ حضور نظام میر عثمان علی خان کی باضابطہ وصیت تھی کہ میں اپنا وارث اپنے پوتے مکرم جاہ کو بنانا چاہتا ہوں۔ حکومت ہند نے اسے تسلیم بھی کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ یہ سب بزرگ دنیا سے گزر گئے۔ اب اس کا ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

**سوال:** مکرم جاہ بہادر کی تعلیمی و سماجی خدمات کے بارے میں بتائیں۔

**جواب:** مکرم جاہ بہادر کے ذہن میں یہ بات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ دنیا کی صرف وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جو تعلیم یافتہ ہو۔ وہ ہمیشہ علم کے حصول پر زور دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ کم از کم ہر شخص اتنا تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کہ وہ صحیح اور غلط کی پہچان کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مکرم جاہ ٹرسٹ فار ایجوکیشن اینڈ لرننگ قائم کیا۔ جس کے تحت کئی اسکول اور کالج کارکرد ہیں، جن میں مکرم جاہ اسکول فار بوائز، مکرم جاہ اسکول فار گرلز، انٹر کالج، پرنس عظمت جاہ لائبریری اور پرنس شاہکار کالج وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے ہی اپنی زوجہ کے نام سے پرنس اسریٰ اسپتال قائم کیا۔ مکرم جاہ نے جو کیا، وہ بڑی خاموشی سے کیا۔ کسی چیز کے بارے میں تشہیر نہیں کیا۔

**سوال:** مکرم جاہ کے ساتھ کس طرح کی یادیں وابستہ رہیں؟

**جواب:** میرے بچپن سے ہی ان سے یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں بھی مکرم جاہ کی تقریر کی اطلاع ملتی، میں ضرور وہاں

پہنچتا۔ وہ ایک بہترین مقرر تھے۔ 1969 سے میں نے ان کے یہاں بطور کنٹرولر چریان پیلس ملازمت شروع کی۔ جس کی 400 ایکٹرز زمین تھی، جہاں زراعت ہوتی تھی۔ اس کا اپنا پٹرول پمپ، تالاب، الکٹرسٹی جنریشن، دھوبی گھاٹ، گھوڑے اور ہاتھیاں بلکہ پوری دنیا تھی۔ اس کا ایڈمنسٹریشن اور مالیہ میرے ذمہ تھا۔ مکرم جاہ کو جانوروں کو مارنے کا کبھی شوق نہیں رہا، لیکن وہ بڑے جانوروں کے قریب تصویر کھینچنے کے شوقین تھے۔ میری حیثیت یہ تھی کہ میں ان کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔

**سوال:** آپ نے مکرم جاہ بہادر کی حیات پر سوانحی کتاب 'اوراقِ ماضی: ہزا ایگزالٹیڈ ہائنس والاشان نواب مکرم جاہ بہادر نظام ہشتم آصف جاہ' لکھی۔ اس کا محرک کیا ہے؟

**جواب:** مکرم جاہ بہادر سے میں اتنا متاثر ہوں کہ اگر ایک جملہ میں کہا جائے تو میں کہوں گا کہ وہ میرے ہیرو اور محسن ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ ان سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے یہ کتاب نہ تو کسی کو خوش کرنے کے لئے لکھی ہے اور نہ ہی کسی کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے۔ میرا مقصد نواب مکرم جاہ بہادر کو ایک کامیاب یا ناکام شخص ثابت کرنا بھی نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی انسان میں فرشتہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے نقطہ نظر سے اگر انسان میں انسانیت نظر آجائے تو کافی ہے۔ میرا مقصد نواب مکرم جاہ بہادر کا بت تراشنا نہیں ہے۔ میں نے دیانت داری سے اس شہزادے کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین کے ذہن میں مکرم جاہ بہادر کی کیا تصویر بنتی ہے۔ مگر یہ پورے وثوق کے ساتھ لکھ سکتا ہوں کہ ہر شخص جسے اوپر والے نے گداز دل سے نوازا ہے، اگر وہ ذہنی تحفظات کے بنا اس کو پڑھے گا تو اسے اس شہزادے سے محبت ضرور ہو جائے گی۔ میں نے اس کتاب میں جو بھی والا شان مکرم جاہ بہادر کے تعلق سے لکھا ہے، اس میں 80 تا 90 فی صد کتاب میرے مشاہدات اور ذاتی تجزیوں پر مبنی ہے۔''

**سوال:** اب جب کہ مکرم جاہ بہادر کا انتقال ہو گیا تو آپ انھیں کس طرح خراج عقیدت پیش کریں گے؟

**جواب:** میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مکرم جاہ بہادر کی رحلت کے بعد میں یتیم ہو گیا۔ انھوں نے مجھے وہی شفقت و محبت دی جو ایک باپ دے سکتا ہے۔ میری جو بھی پہچان بنی، وہ مکرم جاہ بہادر کی وجہ سے ہے۔ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کے تمام اہل خانہ اور چاہنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

**سلطنت آصفیہ کا آخری فرمانروا:** معروف سینئر صحافی محمد مبشر الدین خرم کے مطابق' حکومت ہند نے آصف جاہ ثامن نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کو انضام حیدرآباد کے بعد بھی سلطنت آصفیہ کے آخری فرمارواں کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا اور گزٹ جاری کیا گیا تھا۔ 2 جون 1967 کو اس وقت کے وزیر داخلہ وائی بی چوان نے رکن راجیہ سبھا اے۔ ڈی منی کے سوال کے جواب میں تفصیلات سے ایوان کو واقف کروایا تھا کہ جون 1954 کو نظام دکن نے حکومت ہند کو روانہ مکتوب میں یہ خواہش کی تھی کہ ان کی زندگی میں

یادرفتگاں

انہوں نے اپنے پوترے نواب میر برکت علی خان کو جانشین مقرر کیا ہے۔انہیں ریاست دکن کا فرماروا تسلیم کیا جائے۔ آنجہانی وی بی چوان نے بتایا کہ 1964 میں حکومت نے اس درخواست کو قبول کر کے ایک معاہدہ نواب میر عثمان علی خان بہادر سے کیا تھا۔ 24 فروری 1967 خسروُ دکن نواب میر عثمان علی خان کی رحلت کے بعد صدر جمہوریہ ہند نے نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کو ہندوستان کے دستور کی دفعہ (22) 366 کے تحت ریاست دکن کے فرماروا کا درجہ عطا کیا تھا۔راجیہ سبھا کی کارروائی کے مشاہدہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر انضمام کے بعد بھی فرماروا ریاست حیدرآباد کے طور پر حکومت ہند سے قبول کئے گئے تھے۔آصف جاہ ثامن کی جانشینی کی رسم 16 اپریل 1967 کو ادا کی گئی تھی اور وہ سلطنت آصفیہ کے آخری فرماروا کا اعزاز نومبر 1971 تک رکھے ہوئے تھے لیکن اس کے بعد حکومت ہند کی جانب سے اعزازات کو برخواست کر دیے جانے کے بعد وہ قانونی اعتبار سے فرماروانِ ریاست دکن کے اعزاز سے معزول ہو گئے۔مکرم جاہ بہادر کے حکومت وقت اور حکمرانوں سے کافی گہرے مراسم تھے اور وہ گاندھی خاندان سے کافی قریب سمجھے جاتے تھے۔

(روزنامہ سیاست،حیدآباد16 جنوری2023،صفحہ نمبر:8)

**خلافت عثمانیہ،ترکی اور سلطنت آصفیہ، دکن کے حکمراں اور تاریخی تسلسل:** روزنامہ رہنمائے دکن میں ایک مکمل صفحہ پر مبنی مضمون بعنوان ''نظام حیدرآباد، کرنل امیر الدین اور خلافت عثمانیہ کے مخفی دستاویزات'' شائع ہوا ہے۔جس میں خلافت عثمانیہ، ترکی اور سلطنت آصفیہ، دکن کے حکمرانوں اوران کے تاریخی تسلسل کو پیش کیا گیا ہے۔ذیل کے جدول سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

(روزنامہ رہنمائے دکن،حیدآباد16 جنوری2023،صفحہ نمبر:8)

**خلافت عثمانیہ کے حکمراں:**

| حکمران کا نام | تاریخ |
|---|---|
| امیر غازی ارطغرل | 1191-1298 |
| خلیفۃ المسلمین عثمان بن ارطغرل | 1299-1326 |
| خلیفۃ المسلمین اورخان اول | 1326-1362 |
| خلیفۃ المسلمین مراد اول | 1362-1389 |
| خلیفۃ المسلمین بایزید اول | 1389-1402 |
| خلیفۃ المسلمین مراد ثانی | 1413-1446 |
| خلیفۃ المسلمین محمد فاتح | 1446-1451 |
| خلیفۃ المسلمین بایزید ثانی | 1451-1481 |
| خلیفۃ المسلمین سلیم اول | 1512-1520 |
| خلیفۃ المسلمین سلیمان اول | 1520-1556 |
| خلیفہ المسلمین سلیم ثانی | 1556-1574 |
| خلیفۃ المسلمین مراد ثالث | 1574-1595 |
| خلیفۃ المسلمین محمد ثالث | 1595-1603 |
| خلیفۃ المسلمین احمد اول | 1603-1617 |
| خلیفۃ المسلمین ابراہیم اول | 1617-1648 |

| | |
|---|---|
| خلیفۃ المسلمین خلیفہ محمد رابع | 1648-1693 |
| خلیفۃ المسلمین خلیفہ احمد سوم | 1693-1736 |
| خلیفۃ المسلمین عبدالحمید اول | 1774-1789 |
| خلیفۃ المسلمین محمود ثانی | 1808-1839 |
| خلیفۃ المسلمین عبدالعزیز اول | 1861-1876 |
| خلیفۃ المسلمین عبدالمجید ثانی | 1922-1924 |

**آصف جاہی سلاطین دکن:**

| | |
|---|---|
| نظام الملک آصف جاہ اول | 1724-1748 |
| ناصر جنگ | 1748-1750 |
| مظفر جنگ | 1750-1751 |
| صلابت جنگ | 1751-1762 |
| نظام الملک آصف جاہ دوم | 1762-1803 |
| سکندر جاہ، آصف جاہ سوم | 1803-1829 |
| ناصر الدولہ، آصف جاہ چہارم | 1829-1857 |
| افضل الدولہ، آصف جاہ پنجم | 1857-1869 |
| آصف جاہ ششم | 1869-1911 |
| آصف جاہ ہفتم | 1911-1956 |

**آصف جاہی خون:** سینئر صحافی محمد مبشر الدین خرم اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں کہ ''ریاست دکن حیدرآباد نے 1724 سے 1948 کے دور آصف جاہی میں اپنے 7 آصف جاہوں کو دیکھا اور اس کے بعد آصف سابع کو لسانی بنیادوں کے نام پر سرزمین دکن کو منقسم کرتے ہوئے نئی ریاست آندھرا پردیش کے قیام تک ''راج پرمکھ'' کے طور پر دیکھا لیکن اس کے بعد آصف سابع اور آصف ثامن نے اقتدار سے محرومی کے باوجود اپنی فلاحی، تعلیمی وطبی سرگرمیوں سے لاتعلقی اختیار نہیں کی بلکہ ایسے ادارہ جات کا قیام عمل میں لایا گیا جن سے آج بھی شہریان حیدرآباد فیض یاب ہورہے ہیں۔مکرم جاہ بہادر کی رگوں میں ان کے والد کے سلسلہ نسب سے آصف جاہوں کا خون دوڑ رہا تھا تو والدہ کے سلسلہ نسب سے وہ عظیم سلطنت عثمانیہ کے آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی کے نواسے ہوتے ہیں، اس اعتبار سے دو انتہائی اہم سلطنتوں کے آخری فرمارواں کے فوری بعد والی نسل ہونے کا اعزاز آصف ثامن شہزادہ والا شان، نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر کو حاصل رہا اور ان کی شخصیت میں جو وضعداری تھی وہ دونوں ہی خانوادوں کی عکاسی کرتی تھی جو طویل عرصہ تک دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی خدمت اور اپنے ملک میں رعایا پروری ومذہبی رواداری کے لئے معروف رہے ہیں۔

صبح کے تخت نشین شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

(روزنامہ سیاست، حیدآباد22 جنوری 2023، صفحہ نمبر:16)

## مکرم جاہ بہادر کی زندگی کے کچھ پوشیدہ اوراق:

معروف سینئر صحافی محمد ریاض احمد نے مکرم جاہ بہادر کی وفات کے فوری بعد ایک بہترین مضمون لکھا ہے، جو کہ ہر حیدرآبادی کو ضرور پڑھنا چاہیے۔انھوں نے اپنے کالم میں 'مکرم جاہ بہادر، ارب پتی شہزادہ کی زندگی کے کچھ پوشیدہ

اوراق' کو پیش کیا ہے۔اس اہم کالم کے چند منتخب اقتباسات یہاں پیش ہیں:

- اکثر میڈیا میں نظام سابع اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان کا جانشین بنائے جانے کے حوالے سے یہی بتایا گیا کہ جس طرح ان کے دادا آصف سابع اپنے انتقال تک اس کرہ ارض کے دولت مند ترین شخصیت تھے اسی طرح 1984 تک بھی یہ اعزاز شہزادہ مکرم جاہ کو حاصل رہا کیونکہ وراثت میں انھیں 236 ارب ڈالرس مالیتی اثاثے حاصل ہوئے تھے۔جن کی بہترین مثال نظام دکن کے وہ 173 لاقیمت جواہرات ہیں جنہیں حکومت ہند نے 1995 میں صرف 218 کروڑ روپے کے عوض خرید لئے۔حالانکہ صرف جیکب ڈائمنڈ کی قیمت 1300 کروڑ روپے بتائی جاتی ہے۔ حضور نظام ہیرہ کو بطور پیپر ویٹ استعمال کرتے تھے۔واضح رہے کہ آج کل دار الحکومت دہلی میں ان زیورات کی نمائش ہورہی ہے جبکہ عالمی سطح پر نظام جیولر کو لاقیمت قرار دیا گیا۔
- ان کے ہم جماعتوں میں اردن کے مرحوم شاہ حسین اور عراق کے مرحوم کنگ فیصل بن علی شامل تھے۔
- بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ایک مرحلہ پر مکرم جاہ ہندوستانی فوج میں بھی شامل ہونے کے خواہاں تھے لیکن پنڈت نہرو کو ان کا آئیڈیا پسند نہیں آیا۔پنڈت جی انہیں مغربی ایشیاء کے لئے ہندوستانی سفیر بنانے کے خواہاں تھے۔

(روزنامہ سیاست،حیدآباد22 جنوری 2023،صفحہ 15)

## شیخی کا انجام

کسی گاؤں کے رہنے والے ایک شخص نے کافی عرصہ پردیس میں زندگی گزاری۔واپس آیا تو وہ گاؤں والوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے انہیں عجیب وغریب باتیں سناتا۔ایک روز کہنے لگا۔

''جس وقت میں کابل گیا تو وہاں میں نے ایسی بلند چھلانگ لگائی کہ ایک بڑے اونچے درخت کو پھاند گیا اور اس درخت پر بیٹھے ہوئے تمام پرندے اڑ گئے۔اگر کسی کو میری اس بات پر یقین نہیں ہے تو کابل جا کر تصدیق کر سکتا ہے۔''

یہ سن کر ایک دانا شخص بولا''کابل جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ یہ رہا اونچا درخت، لگاؤ چھلانگ اور اس کو پھاند جاؤ۔''

یہ سن کر شیخی باز سناٹے میں آ گیا۔لگا بغلیں جھانکنے۔سب اس پر پھبتیاں کسنے لگے۔

**حاصل کلام:** شیخی مارنے کا انجام شرمندگی اور ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (حکایات سعدی)

محمد رحمٰن پاشا
مکان نمبر 1-4-549/2/B
باکارم،مشیر آباد،حیدرآباد۔500020
موبائل: 9014430815

# سرراس مسعود اعلیٰ تعلیم میں عمدگی کا حصول

ایک ایسے وقت میں جب ہندوستانی مسلمانوں میں ناخواندگی ایک ''زندگی کی حقیقت'' ہے اور کمیونٹی کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی ادارے اس کی تعلیم کی سیکولر یا مذہبی حالت کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں، تعلیمی فضیلت کی کوئی بھی بات ایک خواب کی طرح لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ملک کے جنوب اور مغرب میں مسلم اداروں کی ایک بڑی اکثریت متاثر کن عمارتوں اور کافی متاثر کن فزیکل انفراسٹرکچر کے پیچھے اعتدال کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اس منظر نامے میں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ تقریباً آٹھ دہائی قبل ایک فرد نے مختصر عرصہ میں اقلیتی تعلیمی ادارے کو بلندی پر پہنچا دیا۔ وہ شخص سرسید راس مسعود (1889-1937) تھا۔ اس کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں عوامی یادداشت کو تازہ کرنا سبق آموز ہوگا کہ اسے امن کے ساتھ آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی اور جو کمال اس نے معجزانہ طور پر ظاہر کیا وہ ان کے دور میں زندہ نہیں رہ سکا۔ یقیناً اس سوانحی خاکے کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

1889 میں دہلی میں پیدا ہونے والے راس مسعود کا نسب بہترین تھا۔ وہ سرسید کے پوتے تھے جن کے بارے میں کوئی وضاحت جگہ اور وقت کا ضیاع ہوگی۔

ان کے والد سید محمود کو کیمبرج یونیورسٹی (1871) سے گریجویشن کرنے والے پہلے مسلمان ہونے کا منفرد اعزاز حاصل تھا اور جن کی بتیس سال کی عمر میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز ہونے نے انہیں اب تک کا سب سے کم عمر جج بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی محمود کو اب عدالتی عہدوں پر فائز ہونے والے روشن ترین فقہا میں شمار کیا جانے لگا۔ ان کے کچھ قانونی کلاسک احکام ایسے ہیں جو آج تک اپنی قوت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، مگر ان کے سفید فام ساتھیوں کے حسد اور ذاتی زندگی میں ان کے اپنے مزاج کی کمی 1891 میں ان کے استعفیٰ کا باعث بنی اور 1902 میں ان کی وفات افسوس کے ساتھ ریکارڈ پر رکھی جانے والی بات ہے۔ مسعود نے نو سال کی عمر میں اپنے دادا کو کھو دیا، بتدریج زوال پذیر والد کی سرپرستی بھی چار سال بعد غائب ہوگئی۔

ایک نوجوان مسعود عملی طور پر متحدہ صوبوں کی حکومت کی جانب سے علی گڑھ کے کلکٹر کی سرپرستی میں تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایم اے او کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں حاصل کی جس کے بعد یوپی میں سرکاری اسکولوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا یہاں تک کہ 07-1906 میں انہیں مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یونیورسٹی آف کیمبرج (کرائسٹ کالج) سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے 1913 میں باوقار انڈین ایجوکیشن سروس میں تقرری حاصل کی۔ وہ ہیڈ ماسٹر رینشا کالجیٹ اسکول، کٹک اور پھر پٹنہ کالج کے پروفیسر کے عہدوں پر فائز رہے۔ 1916 میں وہ نظام حکومت میں بطور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن حیدرآباد میں شامل ہوئے اور بعد میں اسی حکومت کے سیکریٹری برائے تعلیم کے طور پر ترقی دی گئی۔ اس عہدہ پر وہ 1928 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے تک برقرار رہے۔

ان کے علی گڑھ جانے سے پہلے اس مختصر سوانحی خاکے کے بارے میں اہم نوٹ:

یہ بات قابل غور ہے کہ حیدرآباد میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے 'بانیوں' میں سے تھے۔ اس یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم بننے کے بارے میں اپنے تحفظات کے باوجود انہوں نے اس کے قیام میں بہت زیادہ ابتدائی کام کیا۔ انہوں نے فیکلٹی کی بھرتی کرنے میں اور (اس سے بھی زیادہ اہم) مترجمین کی ایک ایسی کہکشاں کو تلاش کرنے اور بھرتی کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس نے یونیورسٹی کے لیے کورس کے مواد کا ترجمہ کرنے کے لیے ٹیم کا بنیادی حصہ بنایا اور جو اب اس کی بنیاد ہے۔

یادرفتگاں

اے ایم یو کے وائس چانسلر کے طور پر ان کی تقرری ایک ایسے وقت میں ہوئی تھی جب آٹھ سال پرانی یونیورسٹی انتہائی بدقسمتی کی وجہ سے خبروں میں تھی۔ایک کمیٹی نے ادارے کے کام کاج میں سنگین انتظامی بے ضابطگیوں اور تعلیمی خامیوں کو بے نقاب کیا تھا۔طلبہ بڑی تعداد میں یونیورسٹی چھوڑ رہے تھے،اس کی ڈگریاں رعایت پر تھیں اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد انڈر کوالیفائیڈ تھی۔پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین کو افسوسناک حالت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور انہیں یونیورسٹی چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔راس مسعود کی تقرری فطری تھی کیونکہ وہ نہ صرف اس کالج کے بانی کے پوتے تھے جو ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا تھا بلکہ حیدرآباد میں ان کے ثابت شدہ ٹریک ریکارڈ کی وجہ سے بھی۔مسعود ایک اور طرح سے منفرد تھے۔وہ عملی طور پر کسی بھی ہندوستانی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر ہونے والے پہلے ماہر تعلیم تھے۔ (ہندوستانی یونیورسٹیوں کے تقریباً تمام وائس چانسلر اب تک ہائی کورٹ کے جج بیٹھے تھے جن میں سے بہت سے یونیورسٹی کی تعلیم بغیر تھے کیونکہ بیسویں صدی کے اوائل تک اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بار کا امتحان دینا ممکن تھا۔
مکھر جی کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہونے کی وجہ سے اس عہدے پر فائز تھے حالانکہ وہ اپنے طور پر ایک نامور ریاضی دان تھے )۔

مسعود علی گڑھ کو جانتے تھے اور اس ادارے کو جو نقصان پہنچا تھا' اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے بغیر کسی تاخیر کے اسے دوبارہ پٹریوں پر ڈالنے اور اونچی پیڈسٹل پر ڈالنے کا کام طے کیا۔ان مراحل کو تفصیل سے بیان کرنا اس تحریر کی حدود میں ممکن نہیں ہے۔صرف مندرجہ ذیل کاموں کا خلاصہ کرنا ممکن ہوگا:

☆ انہوں نے کچھ بہترین دستیاب ہنرمندوں کو تعلیمی عہدوں پر بھرتی کیا تاکہ پوسٹ گریجویٹ تدریس اور تحقیق کو خاص طور پر سائنس میں تقویت ملے۔ان میں سرفہرست تھے: سیموئیل،مشہور طبعیات دان جو جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام کی وجہ سے فرار ہو گئے تھے اور آئن سٹائن اور نوبل انعام یافتہ سی وی رامن نے اس عہدے کے لیے سفارش کی تھی۔ مالیکیولر سپیکٹروسکوپی کے ماہر راگھو کرشنا اسوندی' کیمسٹری میں ہنٹر،آر ڈی ڈیسائی اور سلیم الزماں صدیقی' جغرافیہ میں عبادالرحمٰن اور آنڈرے ویل اور ڈی۔ڈی۔کوسامبی ریاضی میں۔اس طرح کچھ عرصہ میں علی گڑھ اس زمانے کے تیز ترین سائنسی ذہنوں سے بھر گیا۔

☆ انہوں نے حکومت حیدرآباد اور امپیریل گورنمنٹ سے گرانٹ حاصل کی اور ایک 'سائنس کالج' کا قیام عمل میں لایا اور ریکارڈ وقت میں آلات کی تعمیر اور تنصیب مکمل کی۔

☆ ایشیائی براعظم پر جغرافیہ میں پہلا M.A پروگرام متعارف کرایا گیا (1929)۔

☆ علی گڑھ میں آسوندی (فزکس) صدیقی اور دیسائی (کیمسٹری) اور شریف خان،قادری اور ایم اے بصیر (حیوانیات) کی تحقیق کو وسیع پیمانے پر اس وقت کے علم میں قابل قدر اضافہ سمجھا جاتا تھا۔

☆ پہلی بار علی گڑھ کے طلباء نے اپنی انڈر گریجویٹ تعلیم کے اعلیٰ معیار کی تصدیق کرتے ہوئے ICS اور IP امتحانات میں کوالیفائی کرنا شروع کیا۔

☆ رہائش کے ہالوں میں رہائشی زندگی کے انعقاد کے لیے معیاری پروٹوکول وضع کیے گئے تھے جس سے نظم وضبط میں خاطر خواہ بہتری آئی۔

☆ اساتذہ کو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی۔

☆ یونیورسٹی کمیونٹی کے افق کو وسیع کرنے کے لیے مختلف سیاسی رہنماؤں کو باقاعدگی سے دلچسپی کے موضوعات پر بات کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔

☆ وائس چانسلر نے اپنے ذاتی رابطوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یونیورسٹی کو مستحکم مالی بنیادوں پر کھڑا کیا۔

☆ وہ دیگر یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کے ساتھ علی گڑھ کی ڈگریوں کے 'مساوات' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

☆ خواتین کی تعلیم کو یونیورسٹی نے گرلز اسکول کے ہائی اسکول کے امتحان کے انعقاد کی ذمہ داری قبول کرنے اور لڑکیوں کو یونیورسٹی کے امتحانات دینے کی اجازت دے کر تقویت حاصل کی۔

وائس چانسلر کو اپنی تقریری صلاحیتوں اور دلکش آداب کے ساتھ دوسرے تعلیمی اداروں میں بہت زیادہ مانگ تھی جس نے علی گڑھ کو ملک کے بہترین تعلیمی اداروں کے برابر ایک قابل احترام تعلیمی ادارے کے طور پر ابھرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

نتائج بہت زیادہ ثبوت میں تھے۔ نہ صرف اندراج میں اضافہ ہوا بلکہ زیادہ تر کورسز کے لیے درخواست دہندگان کی تعداد دستیاب نشستوں سے تجاوز کر گئی۔ ذہین طلباء کا دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہجرت کرنے کا رجحان الٹا تھا۔ درحقیقت فزکس، کیمسٹری اور جیوگرافی وغیرہ جیسے مضامین کے لیے اے ایم یو ملک بھر کے طلبہ کی سب سے پسندیدہ منزل بن گئی، چاہے ان کے فرقہ وارانہ یا لسانی لیبلز ہوں۔ اسی طرح ایک جگہ پر اتنے روشن خیال نوجوانوں کی موجودگی نے بھی اس کی اسٹوڈنٹس یونین کے پلیٹ فارم کو سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کا ایک من پسند فورم بنا دیا۔ مختصر یہ کہ چند ہی سالوں میں یونیورسٹی کی کارپوریٹ زندگی کو تقویت ملی اور طلبہ اور اساتذہ کی برادریوں کا کل ہند کردار بحال ہوگیا۔

علی گڑھ ملک کی پہلی یونیورسٹی بن گئی جس نے پی ایچ۔ ڈی پروگرام میں طلباء کا داخلہ شروع کیا۔ اس وقت دوسری یونیورسٹیوں میں یہ سہولت اساتذہ تک ہی محدود تھی۔ موجودہ سائنس نے 1933 کے اپنے ایک شمارے میں علی گڑھ کو فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور حیوانیات میں تحقیق کے لیے بہترین جگہ کی نشاندہی کی ہے۔ اخبارات (انگریزی اور اردو) کیمپس کی ترقی کی طرف متواتر رپورٹس شائع کرتے تھے۔ علی گڑھ میں علم کی ترقی کے فروغ پر توجہ دینے والے متعدد پرانے خاندانوں نے پرانے نسخے، فرمان اور ریکارڈ عطیہ کیے جنہوں نے قرون وسطیٰ کی تاریخی تحقیق کی بنیاد ڈالی جو بعد میں علی گڑھ کے تاریخی تحقیق کے اسکول میں کھل گئی۔ پہلی بار دنیا میں کہیں ایک خصوصی شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ان پیشرفتوں کے بارے میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اکثر چھوٹ جاتی ہے۔ اے ایم یو اس وقت بنیادی طور پر ایک نجی یونیورسٹی تھی اسے اپنے زیادہ تر بار بار آنے والے اخراجات کو اپنے وسائل سے حکومتی گرانٹ سے پورا کرنا پڑتا تھا جس کی ضروریات کا بمشکل بیس فیصد تھا۔ چونکہ دیگر یونیورسٹیاں باقاعدہ تحقیق میں شامل نہیں تھیں علی گڑھ کو 'مسابقت' کے معاملے میں ایسا کرنے کی کوئی 'ضرورت' نہیں تھی۔

چونکہ ہم یونیورسٹی کی سیاست کی تاریخ کا سراغ نہیں لگا رہے ہیں ہمیں ان حالات سے نمٹنے کی ضرورت نہیں ہے جن میں انہیں 1933 میں وائس چانسلر کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ کہنا ہی کافی ہے کہ مقامی مفادات اور مایوس کم تعلیم یافتہ اساتذہ نے ایسی صورتحال کو جنم دیا۔ جہاں مسعود جنہوں نے اپنے دادا کے قائم کردہ ادارے کی بھلائی کے لیے آدھی رات کا تیل جلا کر اپنی صحت قربان کر دی تھی، ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے پرانے دوست نواب حمید اللہ خان حکمران بھوپال کی ریاست کا وزیر تعلیم بننے کی پیشکش قبول کر لی۔ راس مسعود نے اپنی بقیہ زندگی ریاض منزل، بھوپال میں گزاری جو ادب کی تاریخوں میں امر ہے کیونکہ یہیں پر ان کے مداح شاعر محمد اقبالؔ نے اپنے معزز دوست کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی عظیم الشان نظم 'جاوید نامہ' ترتیب دی تھی۔

سر راس مسعود کی علی گڑھ میں مشقت سے بے پناہ محبت کی وجہ سے دل کی پیچیدگیوں کے بعد 'فورٹ ایٹ' میں موت واقع ہوئی۔ ایک ایسا شخص مرگیا جس نے خاندانی میراث کو اب تک کی غیر متوقع بلندیوں تک لے جانے کے لیے اپنی پوری کوشش کی تھی یا ایک ناشکری

برادری سے مایوس آدمی ایسا ہے جسے ہم کبھی نہیں جان پائیں گے کہ اس کا جواب اس کے ساتھ اس کے افسانوی دادا اور ذہین باپ کے ساتھ اس کی قبر پر گیا۔

پختہ یقین رکھنے والے اور فضیلت اور دیانت کے لیے غیر متزلزل وابستگی والے، مسعود نے کوئی باقاعدہ اشاعت نہیں چھوڑی ہے۔ تاہم اس کا فلسفہ حیات ان الفاظ میں سمایا ہوا ہے جنہیں اس نے اپنے ساکن الملک' صدق اور دین (ملک، سچائی، ایمان) کے لیے چنا ہے۔ وہ تحریر اور تقریر دونوں میں نمایاں طور پر واضح آدمی تھے۔ ان کے دوستوں اور مداحوں جیسے ''مولانا محمد علی جوہر' شاعر محمد اقبال اور جواہر لعل نہرو'' کو لکھے جانے والے خطوط شائع کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی تقریروں کو بھی جمع کیا جائے تو بہتر ہے جو بکھرے ہوئے ہیں۔ کوئی صرف یہ امید کرسکتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے حقیقی بانیوں میں سے ایک کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جاگ اٹھے گی۔

اس ستم ظریفی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جب نواب مسعود جنگ بہادر سرسید راس مسعود رہے ہیں اور صحیح معنوں میں لوگ انہیں بھول چکے ہیں، انگریزی ادب کے شائقین ان کے نام سے مبہم طور پر واقف ہیں جس کے لئے ان کے اچھے دوست ای ایم فوسٹر نے اپنا کام Passage to India وقف کیا تھا۔

سر راس مسعود کا بھوپال میں انتقال ہوا لیکن ان کی میت علی گڑھ لائی گئی اور اے ایم یو جامع مسجد کے احاطہ میں، سرسید احمد خان کے برابر سپرد خاک کر دیا گیا۔ (ماخوذ)

☆☆☆

آؤ کہانی پڑھیں

## طاقت کا جواب

ایک دن ہوا اور سورج کے درمیان مباحثہ ہوگیا۔ ہوا بولی۔ ''میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ میری لہریں تمہاری شعاعوں کو کمزور کر دیتی ہے''۔

یہ سن کر سورج غصے بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں تو طاقت کا خزانہ ہوں۔ تو نے میری طاقت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔''

جواب میں ہوا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اپنا ثانی دنیا میں کوئی نہیں۔ خشکی پر تیز چلتی ہوں تو درختوں کو اکھاڑ دیتی ہوں۔ سمندر پر تیز چلوں تو طوفان اٹھا دیتی ہوں۔''

سورج نے غصے میں کہا۔ ''اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا کوئی فائدہ نہیں، باتیں نہ بناؤ، مجھے قائل کرنا ہے تو اپنی طاقت دکھاؤ۔''

یہ سن کر ہوا نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، میدان میں موجود اس شخص کے جو کپڑے اتار دے، وہ طاقتور ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مقابلہ منظور ہے۔'' سورج نے ہوا سے کہا۔ ''چلو تو اپنی طاقت کا مظاہرہ پہلے دکھلاؤ۔''

یہ سنتے ہی ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ اس شخص کے کپڑے پھڑ پھڑائے تو اس نے جلدی سے انہیں اپنے جسم پر دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے سمیٹ لیا۔ ہوا نے بھرپور زور لگایا لیکن اس کے کپڑے جسم سے نہ اتار سکی۔ اپنا پورا زور لگا کر تھک گئی۔ ہانپتے ہوئے شرم سے گردن جھکا کر ایک طرف ہٹ گئی۔

اب سورج نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی تیز شعاعیں میدان میں اتر آئیں تو میدان میں قیامت آ گئی۔ گرمی سے مسافر کا برا حال ہونے لگا۔ سارے بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹ گئے۔ لب خشک اور منہ لال سرخ ہوگیا۔ گھبرا کر اس نے کپڑے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ سورج نے فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہا۔

''دیکھی میری طاقت۔ آئندہ کے لیے توبہ کر اور کبھی اپنی طاقت پر غرور نہ کرنا۔''

حاصل کلام: طاقت کا جواب طاقت ہی سے دیا جاسکتا ہے، باتوں سے نہیں۔ (حکایات سعدی)

☆☆☆

# ''سفر ہے شرط'' ۔عورت کے سفرِ حیات کا ساگا

افسانہ ''سفر ہے شرط'' کی مصنفہ قمر جمالی اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، افسانچے، ڈرامے، سفرنامے، رپورتاژ نگاری، تبصرے، تحقیقی و تنقیدی اور تعارفی مضامین بھی لکھے ہیں ۔ان کی جملہ تصانیف میں پانچ افسانوی مجموعے شبیہ (۱۹۹۰ء)، سبو چہ (۱۹۹۲ء)، سحاب (۲۰۰۱ء)، زباب (۲۰۰۷ء)، صحرا بکف (۲۰۱۵ء)، ناول آتش دان (۲۰۱۴ء)، ڈراموں کا مجموعہ سنگریزے (۱۹۹۳ء)، دو مضامین اور تبصروں کے مجموعے انعکاس (۲۰۱۲ء) اور نواحِ ادب (۲۰۱۶ء) شامل ہیں۔ان کے علاوہ بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ایک مجموعہ ابھی زیرِ اشاعت ہے۔

قمر جمالی کے فکشن کی کائنات موضوعات اور فکر و خیال کے اعتبار سے کافی وسیع ہے۔قومی و بین الاقوامی سطح کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی بحران کے انسانی زندگی پر اثرات کا مشاہدہ وہ بڑی گہرائی سے کرتی ہیں۔ان کی کہانیوں میں معاشرتی زندگی کی پیچیدگیاں اور ان میں بسنے والے سینکڑوں افراد کی نجی زندگیوں کے مد و جزر سمٹ آئے ہیں، جن کے مطالعے سے موصوفہ کی فکر و تخیل کی اونچی اڑان اور مشاہدہ کی گہرائی کو بہ خوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔وہ سماج کی نبض کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کرتی ہیں اور حقائق کو بڑی ہی مہارت سے فکشن کا حصّہ بناتی ہیں۔یوں تو انسانی زندگی سے جڑے عام واقعات ان کی کہانیوں کا حصّہ ہیں، لیکن ان کی نظر عورت کے وجود سے وابستہ مسائل پر بھی بڑی گہری ہے۔ان کی کہانیوں میں نسائی حسیّت کی چھوٹی بڑی لہروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔قمر جمالی کا افسانہ ''سفر ہے شرط'' عورت کے سفرِ حیات کی پیچیدگیوں پر مبنی ایک ایسی حساس کہانی ہے جو کسی نہ کسی زاویے سے سماج کی عام و خاص یعنی ہر عورت کے وجود کو اس سے جوڑ دیتی ہے۔یہ افسانہ اردو جرنل ''ادب سلسلہ'' شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔

عورت کا وجود کائنات کا سب سے اہم جز ہونے کے باوجود نجی یا سماجی سطح پر اہمیت اختیار نہیں کر پائی۔گذری صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ہر دور میں عورت کا وجود ثانوی سمجھا گیا اور اسے نظر انداز کیا گیا۔تاریخی، تہذیبی یا ثقافتی حوالوں سے عالمی سطح پر عورت کے وجود کی ارزانی یا اس کی مسخ شدہ تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔دراصل سماجی نظریات اور ضوابط کے دائرے میں رکھ کر صدیوں سے عورت کے لیئے زندگی کی راہیں مشکل اور نہایت پیچیدہ بنادی گئیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان ہی راہوں پر چلنے کے لیئے اسے مجبور بھی کیا جاتا رہا ہے۔وہ اپنے تشخص اور باوقار زندگی کی تلاش میں کسی اور راہ کا تعین بھی نہیں کرسکتی۔صدیوں سے صنفی نظریات سے بھرے رواجوں اور روایتوں کی پاسداری والی راہوں پر چلتے ہوئے وہ تھکن زدہ ہونے کے باوجود ہر بار ایک نئی زندگی کی تخلیق کے لیئے منزل بہ منزل سخت ترین سفر طے کرتی رہتی ہے۔صدیوں کے اس سفر کے متعلق، بانو دارب وفا کے دو اشعار رقم کرنا یہاں بے جانہ ہوگا۔وہ لکھتی ہیں

تھکن سے چور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں
نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں
ہوائیں میری ورق لوٹ لوٹ دیتی ہیں
نہ جانے کتنے زمانوں کی داستان ہوں میں

قمر جمالی کا افسانہ ''سفر ہے شرط'' پیچیدہ راہوں پر عورت کے سفرِ حیات کی جزیات کو پیش کرتا ہے۔ان کی بیشتر کہانیوں میں انسانی زندگی کی پیچیدگیاں بشمول عورت کی زندگی کی نارسائیاں، مرد و عورت کے درمیان رشتوں کی رسا کشی، انسانی اقدار کی پامالی کے کئی ایک رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔انہیں زبان اور جذبات و احساسات کے مناسب اظہار پر مکمل دسترس حاصل ہے۔وہ بڑی ہی فنکاری اور اختصار سے لفظوں کا استعمال کرنا خوب جانتی ہیں۔مختصر جملے یا کبھی کبھی ایک یا ایک سے زائد الفاظ یا مختصر جملوں کے ساتھ افسانے کا تانہ بانہ بنتی چلی جاتی ہیں اور بین السطور میں زندگی کا اہم فلسفہ رقم کرجاتی ہیں۔ان کے افسانوں کی شروعات ایسے الفاظ سے ہوتی ہے جس میں فلسفہ، تجسس اور تحیر کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔یہی تجسس کی زیریں لہر قاری کی دلچسپی کو افسانہ کی ابتداء سے لے کر اختتام تک باندھے رکھتی ہے۔جیسے زیرِ بحث افسانہ ''سفر ہے شرط'' کے یہ دو ابتدائی سطور ملاحظہ کیجئے۔

''سفر ہے شرط مگر.........

اسی اگر مگر کے بیچ ساری کائنات کا رمز پوشیدہ ہے۔''

افسانے کی مذکورہ سطور پر غور کیا جائے تو کائنات میں جاری کشمکشِ حیات کی سینکڑوں تصویریں ذہن میں ابھرنے لگتی ہیں اور کئی سنی اَن سنی کہانیوں کی صدائیں کانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں قاری مکمل طور پر کہانی کے ساتھ ساتھ اپنی کشمکشِ حیات کے پیچ وخم سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ حالات کے یہی پیچ وخم اس کی حیات کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل کائنات کا یہی رمز کشمکشِ حیات سے مربوط ہے اور کشمکشِ حیات انسان کو منزل در منزل سفر پر اُکساتی رہتی ہے۔ انسان کبھی خوشی اور چاہت سے سفر کرتا ہے تو کبھی وہ سفر مجبوراً اس کی زندگی کا حصّہ بن جاتا ہے۔ تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقاء اور سماج کی تشکیلِ نو کے تسلسل کے لئے حیاتِ انسانی کا یہ سفر ناگزیر بھی ہے۔ پیشِ نظر کہانی کے بین السطور میں یہی فلسفۂ زندگی رواں دواں نظر آتا ہے۔ افسانے کے ابتدائی چند جملے اسی فلسفۂ زندگی کے بہترین ترجمان ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''زندگی ایک مسلسل سفر ہی تو ہے۔ منزل در منزل
انسان لاشعوری طور پر جانے کتنی ایسی منزلوں پر سفر کرتا ہے اور کسی پڑاؤ پر پہنچ کر اُسے اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے۔
مگر..... پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ایک اور منزل متقاضی سفر ہے۔''

بالخصوص جب عورت کے سفرِ حیات کی بابت غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے وجود کو مکمل طور پر آج بھی قبول نہیں کیا گیا۔ سماج میں مرد وعورت کے مقام ومرتبہ کو لے کر نابرابری اور عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ بیشتر نجی وسماجی معاملات میں مرد کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے جبکہ عورت کے لئے سخت سماجی ضابطے بنا دیے گئے ہیں جس کی تعمیل اور تکمیل عورت پر فرض بنا دی گئی اور اس کی مرضی یا پسندیدگی کا حق اس سے چھین لیا گیا۔ یہ نابرابری مرداساس سماج میں صدیوں سے رائج ہے۔ زیرِ بحث افسانہ ''سفر ہے شرط'' ایسے ہی پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے جس کی کئی ایک جہات ہیں۔ کہانی کا موضوع اگرچہ کہ ایک کتیا ''شونا'' کا لاعلاج مرض میں مبتلا ہونا اور Mercy Killing کے طریقۂ کار سے کتیا کو ختم کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ لیکن افسانے میں ''شونا'' سے وابستہ افراد کی زندگی اور ان کی فکر وعمل کو واضح کرنے والے واقعات کو اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ کہانی کی کئی پرتیں بن گئی ہے۔ دراصل ''شونا'' کے علاوہ دیگر کرداروں کی زندگی کی جھلکیوں کے ذریعہ عورت کی کشمکشِ حیات کو کچھ اس طرح سے مربوط کیا گیا ہے کہ کہانی کا موضوع کافی تہہ دار بن گیا ہے۔ ان تہ داریوں سے ہوتے ہوئے قاری جب افسانے کے اختتام تک پہنچتا ہے تب تک عورت کی زندگی کے نشیب وفراز، محرومیوں ومجبوریوں اور سماجی تقاضوں کے آگے اس کی قربانیوں کے انیک روپ سے واقف ہو جاتا ہے۔

مصنفہ نے افسانے میں نہ صرف کرداروں کی زندگی سے جڑے واقعات اور ان کی فکر وعمل کو موضوع بنایا ہے بلکہ کہانی میں ایسے کئی اشارے، کنائے اور جزیات بھی پیش کیے ہیں جو مختلف سطحوں پر قاری کی فکر کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور وہ ان اشاروں کو انسانی زندگی کی پیچیدگیوں سے جوڑ کر سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار ''رافعہ'' اشاروں سے بھرے راستہ پر اپنی کار میں سفر کرتی رہتی ہے اور ساتھ میں اس کے درونِ ذات کا سفر بھی جاری رہتا ہے۔ وقفہ وقفہ سے کسی کی مداخلت یا کسی اشارے کی وجہ سے وہ ماضی سے حال کی طرف لوٹتی رہتی ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کی جستجو لیے کار کے سفر کو جاری رکھتی ہے۔ اس سفر کے دوران مختلف مقامات پر سگنل ملنے پر کار کا رُکنا، پھر کسی اشارے یا کسی کی تحریک پر رافعہ کا اپنی کار کو آگے بڑھانا اور وقفہ وقفہ سے ماضی تا حال کے واقعات کی یادوں میں اس کا گھر جانا' جیسے عناصر افسانے کی معنویت میں بے انتہاء اضافہ کرتے ہیں اور ایک عورت کے سفرِ حیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل رافعہ کی زندگی کا سفر بھی اس جاری سفر سے بالکل مشابہ تھا۔ اس نے بھی کسی عارضی پڑاؤ کو دیکھ کر اسے اپنی منزل سمجھنے کی بھول کر لی تھی۔ نتیجے میں سخت اور ناہموار راہیں اس کا مقدر بن گئی تھیں۔ عدم اطمینان، بے سکونی اور بے قراری اس کی زادِ راہ تھی اور اس کی زندگی کا سفر یوں ہی جاری تھا۔ رافعہ کی خود کلامی میں اس کرب کو محسوس کیجیے:

''اس نے بھی شاید کسی پڑاؤ ہی کو اپنی منزل سمجھ لیا تھا۔
''مگر...... یہ بے چینیاں ـــــ یہ ادھورا پن ـــــ یہ اندر ہی اندر ٹوٹنے پھوٹنے کا احساس۔

ضمیر کے کچوکے اور اندر اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔ کچھ کہی اَن کہی کہانیاں ـــــ یہ سب کیا ہیں ـــــ؟!

زیرِ بحث افسانے میں حیاتِ انسانی کی کشمکش کو دو مختلف طرزِ معاشرت سے تعلق رکھنے والے مرد و عورت کے درمیان ذہنی و جذباتی تصادم سے واضح کیا گیا ہے۔ افسانے کے دو مرکزی کردار 'ارشد' اور 'رافعہ' سماج کے دو مختلف طبقات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'ارشد' اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جو سماج میں ''اعلیٰ و سفید پوش'' کہلاتا ہے۔ سماج کا یہ ایسا طبقہ ہوتا ہے جن کے پاس انسان تو انسان جانور بھی تعیش کی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے ہاں اخلاق و اقدار کی کوئی حدیں متعین نہیں ہوتیں۔ اکثر گھرانوں میں ماں باپ اور بیٹا ہم پیالہ ہوتے ہیں اور بیٹی کے لئے ''لیو اِن ریلیشن شپ (' live in relationship') کی زندگی کوئی معیوب بات نہیں لگتی۔ جبکہ ارشد کی بیوی رافعہ ایک متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اور باشعور خاتون ہے۔ اس کی پرورش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں اخلاقیات کی حدیں مذہب و تہذیب سے ہو کر گذرتی ہیں۔ جہاں بچپن سے ہی گناہ اور ثواب، پاک اور نجس کا فرق ذہن میں پیوست کر دیا جاتا ہے۔ سماج کا یہ طبقاتی فرق بیشتر صورتوں میں جبر و استحصال کا سبب بنتا رہتا ہے۔ سماج میں ''اعلیٰ طبقہ'' سے تعلق رکھنے والے افراد متوسط گھرانوں کی درجہ بندی ''قدامت پرست' خاندان یا افراد'' کے نام سے کرتے ہیں اور ان کے سماجی اقدار اور اصول و ضوابط کو ''مڈل کلاس منٹالیٹی (Midddle class mentality)'' کا نام دیتے ہیں۔ ارشد ہمیشہ رافعہ کی شخصیت کو سماج کے اسی متوسط درجہ میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ دونوں کی زندگی میں بظاہر سب کچھ بہتر نظر آتا ہے لیکن دونوں کے درمیان طرزِ معاشرت اور نظریات کا فرق ان کی ازدواجی زندگی میں اکثر ذہنی و جذباتی ٹکراؤ اور تناؤ کا سبب بنتا ہے۔ وہ ٹکراؤ کہیں نہ کہیں طوفان کھڑا کرنے کے قریب بھی ہونے لگتا ہے' لیکن رافعہ اس طوفان کے بعد کی تباہی کے خوف سے ہمیشہ اپنے احساسات و جذبات پر صبر و خاموشی کا بند باندھ لیتی ہے اور نہایت خاموشی سے اس طوفان کو گذار دینے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس کا وجود اور تشخص مسمار و متزلزل ہوتا رہتا ہے۔ مصنفہ نے عورت و مرد کے درمیان رشتہ میں پیدا ہونے والے ذہنی و جذباتی تصادم اور خیالات کا ٹکراؤ کو ایک عورت کی نظر سے دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے رافعہ کے درد کی گہرائیوں کو سمجھا اور اس مسلسل کرب و اندرونی خلفشار کو کہانی میں ڈھالا جس میں ایک عورت اپنی نجی زندگی میں پیدا ہونے والے طوفان کے آگے اپنے وجود کو بکھرنے سے کس طرح بچاتی رہتی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر کیسے حالات سے سمجھوتا کرتی رہتی ہے۔

رافعہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والدین کار حادثہ میں انتقال کر جاتے ہیں جس کے بعد وہ خود کو انتہائی بے بس و تنہا محسوس کرتی ہے۔ ایسے وقت میں وہ کسی غم گسار ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتی ہے اور کسی کمزور لمحہ میں اپنی کمپنی کے باس 'ارشد' کی پیشکش قبول کر لیتی ہے اور اس سے شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے۔ ارشد ایک ''ویڈوور (Widower)'' ہے۔ جس کے دو بچے بھی ہیں جو عمر میں کافی بڑے ہیں۔ ارشد شادی سے قبل رافعہ کو اپنے بچوں کے متعلق نہیں بتاتا ہے۔ شادی کے فوری بعد اس حقیقت سے آگہی رافعہ کے وجود پر بڑی کاری ضرب لگاتی ہے۔ اس زخم کو چھپا کر رافعہ زندگی کے سفر پر آگے بڑھنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے لیکن قدم قدم پر اس کا وجود کسی نہ کسی سبب مسمار ہوتے رہتا ہے۔ چونکہ ارشد اور اس کے بچے ایسی جدید تہذیب کے پروردہ ہیں جہاں کوئی عمل غلط قرار نہیں دیا جاتا۔ رابعہ کو شادی کے بعد ارشد کے طرزِ حیات کے علاوہ اس کے بچوں کی آزادانہ اور عیش پرست زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سامنا ہوتا ہے۔ یہ دنیا اسے اپنی خواب و خیال کی معصوم سی دنیا سے بالکل مختلف لگتی ہے۔ اس نئی زندگی کا حصہ بننے کے لیے ہر قدم پر اسے اپنے تشخص کو مارنا اور سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ یہی احساس کی شدت اس کی شخصیت کو بے قراریاں عطا کرتی ہے اور اس کے اندر ہر لمحہ ٹوٹنے پھوٹنے کا عمل جاری ہی رہتا ہے۔ زندگی کے متعلق اپنے غلط فیصلے پر ضمیر کے کچوکوں کی وجہ سے اس کے اندر کی دنیا میں اُتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔ یہ اتھل پتھل اس وقت اور بھی شدت اختیار کر جاتی جب ارشد شراب کے نشے میں دھت رات اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا اور وہ خود کو رضائی میں مزید سمیٹ کر سوتی بن جاتی۔ ایسے لمحوں میں اس کی سماعتوں پر وہ آفاقی پیغام گونجنے لگتا جو جوانی کی دہلیز پر پہنچنے کے بعد اسے بارہا سنایا گیا کہ ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں''۔ اس پیغام کی گردان اسے مزید بے چین کر دیتی اور وہ اس ہدایت کے پیمانہ پر خود کو جانچنے سے بچا نہیں پاتی اور پھر صحیح اور غلط کے دوراہے پر الجھی الجھی کھڑی ہی رہ جاتی۔

رافعہ کو اس بات کا شدت سے احساس ہو جاتا ہے کہ جس زندگی کا وہ خواب دیکھتی تھی وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اب تو وہ اس طرزِ زندگی میں محض

مضامین

پیوند کی طرح جڑی ہوئی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کے باوجود مخالفت کے راستے کو اپنا نہیں سکی بلکہ اس نے یہ قبول کرلیا تھا کہ زندگی اب صرف بہتی لہروں پر ڈولنے کا نام ہے۔ لہروں کی مخالف سمت میں سفر کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ .وہ دراصل عورت کے متعلق سماجی نظریات اور اس کی زندگی سے جڑے حقائق سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی اسی لئے اس نے زندگی کی بہتی لہروں کے خلاف جانے کے بجائے ان کے ساتھ ہی بہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ''لہروں کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو روکو تو اذیتیں اٹھانی پڑیں گی۔''

زیرِ بحث افسانے میں ارشد اور رافعہ کے علاوہ تیسرا کردار ایک کتیا ''شونا'' کا ہے۔ جو ارشد کے گھر کی اہم مکین ہے۔ شونا اس کہانی کی اصل محرک بھی ہے۔ 'شونا' سے 'ارشد' کو والہانہ پیار ہے۔ لیکن رافعہ کے لئے 'شونا' ایک نجس جانور ہے۔ اسی لیے اسے ہمیشہ کراہیت کا احساس رہتا ہے۔ 'شونا' کو وہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے نہیں دیتی تھی اور نہ کبھی ہاتھ پیر چاٹنے کی اجازت تھی۔ جب بھی اس کا لعاب اس کے کپڑوں پر لگ جاتا اور اس کے منہ سے ''چھی'' نکل جاتا' سمجھو اس دن گھر میں تنازعہ ہوجاتا۔ ارشد کو شونا کو دِھتکارنا ایک نظر نہ بھاتا اور وہ رافعہ کے سلوک کو 'مڈل کلاس مورالیٹی'' کا طعنہ دے کر اس کے باپ دادا تک پہنچ جاتا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے رافعہ کو شونا سے جذباتی لگاؤ پیدا ہوتا گیا اور وہ اس سے پیار کرنے نیز اس کی بہترین دیکھ بھال کرنے لگی۔ اسی دوران ارشد کسی حادثہ کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قاصر ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کی خدمت اور دیکھ بھال بھی رابعہ کے ذمہ ہوجاتی ہے۔ چونکہ شونا' اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکی اور ایک لاعلاج مرض میں مبتلا جاتی ہے اسی لیے ارشد مجبوراً اسے ''مرسی کِلنگ (Mercy killing)'' کے ذریعہ مار دینا چاہتا ہے اور رابعہ کو شونا کی موت کے لئے وٹرنری ڈاکٹر کے انتظام کا حکم دیتا ہے۔ اسی انتظام کے سلسلے میں رافعہ اپنی کار سے ڈاکٹر کی جانب نکل پڑتی ہے اور اس سفر کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی تا حال کا سفر بھی طے کرتی ہے۔ ذہنی وجذباتی کشمکش میں مبتلا رابعہ ڈاکٹر کو لے کر گھر پہنچ جاتی ہے۔

''مرسی کلینگ'' سے قبل جب رافعہ کمزور ولاغر، بے حد تکلیف میں مبتلا 'شونا' کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے اور اس کے چہرے کو بغور دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر 'رافعہ' کو وہی درد اور کسک نظر آتی ہے جو کئی برسوں سے اس کے اپنے وجود کا حصّہ رہی ہے۔ 'شونا' کی آنکھوں میں وہی سوال نظر آتے ہیں جو اس کے اپنے لاشعور میں برسوں سے جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ سوال جو اس کی زندگی کے خالی پَب سے جڑے ہیں۔ ان سوالوں کی بازگشت اسے ہمیشہ بے قرار رکھتی ہے۔ رافعہ نے زندگی کے ہر موڑ پر سمجھوتہ تو کرلیا لیکن نتیجے میں اسے بے شمار درد اور رنج کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ زندگی کے سفر میں اسے اپنی کوکھ سے جنم لینے والی مسرتوں سے بھی سمجھوتا کرنا پڑا۔ ممتا سے خالی وجود نے اس کی دوڑتی بھاگتی زندگی کے متعلق کئی سوال قائم کئے تھے۔ اس نے بظاہر زندگی سے سمجھوتہ تو کرلیا تھا لیکن وجود کے اندر اٹھنے والے سوالوں کے جواب نہیں ڈھونڈ پائی تھی جو اس کی اپنی سونی گود سے جڑے تھے۔

سخت تکلیف میں مبتلا' زندگی اور موت سے لڑتی شونا کو دیکھ کر رافعہ کا اندرونِ ذات کلفشار بڑھ گیا تھا۔ اس کے اندر گذرے برسوں کی یادیں اور ادھورے سوالوں کی بازگشت اپنے عروج پر تھی۔ اس ذہنی خلفشار میں ایک سوال اور بھی جڑ گیا تھا کہ کیا اس کا انجام بھی شونا کی طرح کا ہوگا۔۔۔۔۔؟ شونا کی طرح وہ بھی تو کسی اولاد کو جنم نہیں دے سکی۔۔۔۔ یہ سوچ اسے درد کے اتاہ سمندر میں ڈبو گئی۔ اسے شونا کا اور اپنا درد مشترک لگنے لگا اور وہ اپنا موازنہ ایک کتیا کی زندگی سے کرنے لگی۔ رابعہ کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''اس کی آنکھوں کی بے بسی میں میں نے خود کو دیکھا ہے۔ کل کو میرا بھی یہی حشر ہونا ہے......

میری تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔''

رافعہ' کے ذہن میں اٹھتا یہ سوال اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ جیسا کہ رابعہ نے بدلتی زندگی کے تمام تر تقاضوں کو قبول کرلیا تھا اور اپنے تشخص کو مٹا کر اپنے وجود کو مکمل طور پر بہتی لہروں کے سپرد کردیا تھا۔ کئی رشتوں کے درمیاں رہتے اور انھیں خوش اسلوبی سے نبھانے کے باوجود' اس کو برابر کا مقام نہیں مل پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تنہائی، بے نام سی کسک اور بے قراری اس کے وجود کا حصّہ بنتی چلی گئی۔ زندگی نے اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا تو سکھا دیا تھا لیکن اس کے درونِ ذات چلنے والی جنگ پر وہ پوری طرح قابو نہ پا سکی اور اپنے وجود کے خالی پن کو وہ دور نہ کر پائی۔ زندگی بھر سہتے رہنے والی نارسائیوں کی کسک دراصل آج شدت اختیار کرگئی تھی۔ اس لمحے میں رابعہ کو اپنی زندگی بھی شونا کی طرح بے مول و بے معنیٰ لگی۔ احساس کی شدت سے وہ بے حد غم زدہ ہوجاتی ہے اور بے ہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔

دوسری طرف وٹرنری ڈاکٹر' ارشد کے کہنے پر ایک انجکشن لگا تا ہے اور شونا کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ رابعہ کی دِگرگوں حالت دیکھ کر ارشد بھی پریشان ہو اُٹھتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اس ڈرامائی سین کے ساتھ افسانے کا اختتام ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ اختتام سماج میں عورت کے موقف اور اس کی ''انسانی حیثیت'' پر کئی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔

رافعہ کا کردار دراصل ایک ایسی ہندوستانی عورت کی ترجمانی کرتا ہے جو تعلیم یافتہ و باشعور عورت ہے۔ جو زندگی کے ناہموار راستوں سے پریشان ہوکر اپنی راہیں بدلتی نہیں ہے بلکہ اپنے زخمی وجود کے ساتھ ان ہی راستوں پر سنبھل کر سفر کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ اس لیئے کہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ماضی تا حال مرد اساس معاشرے نے کبھی عورت کے تشخص کو اہمیت نہیں دی۔ وہ آج بھی سماج میں مرد کے برابر باوقار موقف یا اپنا کوئی مکمل وجود نہیں رکھتی بلکہ رشتوں کے پیمانہ پر جانچی جانے والی ایک شئے کا مقام رکھتی ہے۔ وہ صدیوں سے ثانوی درجہ پر ہی رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اس کے مسائل بھی انسانی حیثیت سے اوّلیت یا اہمیت اختیار نہیں کر پائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگر کوئی عورت زندگی کی ناہمواریوں سے خائف ہوکر اپنے لئے دوسرا رخ اختیار کرنے کی ہمت کر بھی لیتی ہے تو اسے مزید خاردار راہوں سے گذرنا اور ہر سمت سے آنے والی بادِ مخالف کو برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے والی تنہا عورت کے لئے سماج مزید مشکلات پیدا کرتا آیا ہے۔ قمر جمالی نے زیرِ بحث افسانے کے ذریعہ دراصل ایک عورت کی کشمکشِ حیات کے ایسے ہی مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے صدیوں سے چلی آرہی عورت کی زبوں حالی پر سماج سے راست سوال نہیں کیے بلکہ رافعہ کی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے مرد اساس معاشرے کے آگے غور وفکر کے کئی دریچے کھول دیے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ کے اختتام پر قاری کے ذہن میں کئی سوال اٹھنے لگتے ہیں:

☆ کیا عورت کبھی سماج میں بہ حیثیت انسان' زندگی کی لہروں میں اپنی مرضی سے بہنے کا حق حاصل کر پائے گی؟ سماج نے یہ حق اور اختیار صرف مرد کو ہی کیوں دیا ہے؟

☆ سماج کے طے شدہ روایتوں اور تقاضوں کے ساتھ چلنے سے عورت خود کو کبھی روک لے تو کیا اُسے اذیتیں ہی اُٹھانی پڑیں گی؟

☆ زندگی کا تصوّر عورت و مرد کے آزادانہ مقام لیکن یکساں اشتراک سے ہے تو پھر زندگی کے سفر میں ایک آزاد تو دوسرا محکوم کیوں ہے؟

☆ ہر موڑ پر سمجھوتے عورت کے نام ہی کیوں کردیے جاتے ہیں اور ہمیشہ اسے ہی ''پیوند'' کی طرح کیوں جڑنا پڑتا ہے؟

☆ کیا افزائشِ نسل کے بغیر عورت کا وجود نامکمل ہے اور عدم تکمیل کا احساس اس کے لیے اتنا سوہانِ روح ہے کہ وہ اپنا موازنہ ایک کتیا سے کرنے لگے؟

☆ کیا آج کا تعلیم یافتہ ومہذب معاشرہ آفاقی پیغام ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں'' کے اصل پس منظر کو سمجھنے اور اس کی صحیح تفہیم وترسیل کا ذمہ لے سکتا ہے؟

☆ کیا سماج میں آج ''صنفی مساوات پر مبنی'' اوّلین پیغام ''شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کا لباس ہیں'' کی عام ترویج ممکن ہے؟

مذکورہ افسانہ ''سفر ہے شرط'' کے تناظر میں ان تمام سوالوں کے جواب سماج کو ڈھونڈنے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر آمنہ تحسین
ڈپارٹمنٹ آف ویمن ایجوکیشن
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی' حیدرآباد۔500032

مضامین

# ہندوستانی کلچر اور تہذیب کے علمبردار: کبیر

قدیم ہندوستان میں ہندو و مسلم ایک دوسرے میں جذب ہونے کے لیے سازگار نہیں تھے مگر رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے جس کا اثر ہمارے کلچر وتہذیب پر دکھائی دیتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی کلچر وتہذیب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے لگے اوے ایک دوسرے کی بولی بھی استعمال کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی بھاشا کا جنم دیا، وہ ہے اردو بھاشا۔ جیسے:۔

''اردو زبان کے ساتھ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا ذکر لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح ہندو مسلمانوں کے ثقافتی میل ملاپ کا نتیجہ اردو کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اسی طرح دونوں قوموں کی صدیوں کی زندگی کے طور طریقے، فکر ونظر، دین ومذہب، مزاج ومذاق، آداب واخلاق، رہن سہن، رسم ورواج اور علمی، ادبی وسماجی ذوق وشوق کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے، سمجھنے سمجھانے اور شیر وشکر ہوجانے سے جن ملی جلی قدروں نے جنم لیا وہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی علمبردار کہلائیں''۔

(اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتب، ڈاکٹر کامل قریشی، ص۔۱۱)

کلچر اور تہذیب سے متعلق پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''اردو نے فارسی سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کی رگوں میں ہندوستانی خون ہے۔ اس کا ادب ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگ فضا میں پروان چڑھا ہے۔ اس کے مشاعرے، بعض اوزان وبحور، اس کی سراپا نگاری، اس کی بیانیہ نظمیں، اس کے بارہ ماسے، اس میں محبت کی لفظیات بیانِ فراق یا برہ ورنن، اس کی بعض صوفی اصطلاحیں، بعض اور اردو وظائف ذوق وشوق کے کلمات پیا اور ساجن، رسم ورواج، وضع قطع، لباس وآرائش، گھر کی فضا، غرض اس کی زمین، اس کا آسمان یکسر ہندی الاصل ہیں۔''

(اردو ادب اور قومی یک جہتی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ غالب نامہ، ص، ۴۸۔۴۷)

سنت کبیر سچے سماجی اصلاحی تھے یہ سکندر لودھی کے دور کے تھے۔ کبیر کی پیدائش کو لے کر بہت سے اختلافات ہیں، کچھ لوگوں کا کہنا ہے ان کا جنم ۱۴۲۵ء میں ہوا اور کچھ کا ماننا ہے کہ ۱۴۴۰ء میں ہوا۔ مگر اب تک کی تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی ولادت ۱۳۹۸ء میں ایک براہمنی عورت کے بطن سے کاشی اتر پردیش میں ہوئی۔ عورت شرم وعزت کے ڈر سے وارانسی (کاشی) نیا نام بنارس کے لہرتارا تالاب کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ 'نیرو ونیا' نام کے جلاہا اسے اپنے گھر لے آئے اور اس کی پرورش کی جس کا نام کبیر

مضامین

رکھا۔کبیر خود تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

(۱)''کاشی میں پرکٹ بھئے ،رامانند چیتائے''

(۲)''کبیرا جب ہم پیدا ہوئے، جگ ہنسے ہم روئے
ایسی کرنی کرچلو، ہم ہنسے جگ روئے''

کبیر کے معنی عربی بھاشا میں مہان ، Great اور Leader وغیرہ کہتے ہیں۔کبیر، رامانند جی کے شاگرد تھے کبیر کی بھاشا سدھوکڑی (Sadhukadi) یا Sadhukkari، پنچ میل کھچڑی اودھی ، راجستھانی ، پنجابی اور ہندی وغیرہ سے ملتے جلتے ہیں۔یہ سماج میں پھیلی برائیوں کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں ، روایت اور کٹر رتا کا منہ توڑ جواب دیتے ہیں۔

''پوتھی پڑھ پڑھ جگ مُآ ، پنڈت بھیا نہ کوئے۔
ڈھائی آکھر پریم کا، پڑھے سو پنڈت ہوئے''

یہ ذات پات ، مذہبی ، روایت ، دکھاوا ، مورتی پوجا، جب تپ ، اوتار واد اور مسجد میں عبادت وغیرہ کی زبردست مخالفت کرتے ہیں' ان کے دوہوں سے پتا چلتا ہے۔کبیر بانی آج بہت مشہور ہے۔ان کے خطبہ بیجک میں ساکھی ، شبد، رمینی ، باون اچھری اور الٹ واسی میں موجود ہے۔ ہندوؤں میں جو ایک روایت چلی آرہی تھی کہ کاشی میں مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جاتے ہیں اور مگہر میں مرنے پر دوزخ ملتی ہے۔کبیر جی نے اس کی مخالفت کر کاشی چھوڑ کر مگہر چلے گئے اور ۱۵۱۸ء مگہر میں ہی انتقال پایا۔ کبیر کو ہندو مسلم دونوں مذاہب کے لوگ مانتے ہیں۔جس کو کبیر پنتھی کہتے ہیں اور دوہوں کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔دوہا ملاحظہ ہو:۔

''ماٹی کہے کمہار سے ،تو کیا روندے موح
ایک دن ایسا آئے گا ، میں روندں گی توئے''

کبیر جی کی عمر کے متعلق مختلف آرا ہیں۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کبیر داس نے ۱۱۹ سال کی عمر پائی۔ان کا ایک بیٹا کمال اور ایک بیٹی کمالی تھی ۔ یہ فقیرانہ لباس میں رہتے تھے،ان کے گھر پر صوفیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ یہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔خود کہتے ہیں:

''مَسی کاگد چھوؤں نہیں،کلم گھوؤں نہی ہاتھ
چھارو جگ کے مہاتم کبیرا مکھ جنائی بات''

ایچ ایچ ولسن کے مطابق کبیر کے آٹھ گرنتھ ہیں۔ جی ایچ ویسٹکاٹ نے کبیر کے ۸۴ گرنتھ اور رام داس گوڑ نے ۷۱ کتابیں گنائی ہیں ۔ کبیر جی کے دوحوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانیت میں یقین رکھتے تھے اور بتاتے ہیں چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

''بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو چھایا نہیں پھل لاگے اتی دور''

کبیر جی نرگن بھگتی تعلیم سے ہمیں روشناس کراتے ہیں، کبیر کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کو کبیر پنتھی کہتے ہیں۔ آج بھی کبیر پنتھی کے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

بقول سید عابد حسین:

''اپنی تعلیم کو بھگتی کے اور علم برداروں کی طرح نہ کوئی منظم شکل دی اور نہ قلم بند کیا بلکہ اپنے خیالات و جذبات کو متفرق گیتوں میں ظاہر کیا ہے جوان کی زندگی میں زبانی گائے جائے تھے اور آگے چل کر متعدد کتابوں میں جمع کیے گئے۔ بہت سے ہندو مسلمان ان کے پیروؤں کے سلسلے میں داخل ہو گئے آج بھی کبیر پنتھی خاصی تعداد میں موجود ہیں'' (اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتب، ڈاکٹر کامل قریشی، ص۔۲۰)

ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی روایت کبیر نے قائم کی تھی۔ اس پر کبیر پنتھی سماج آج بھی ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ سبھی انسانوں کو جوڑنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ کبیر جی کی تحریک ہمیں حقیقت نگاری سے روشناس کراتی ہے اور ایک نئی زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ کبیر ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ کبیر بانی کے کچھ دوہے ملاحظ ہوں:

'' بُرا جو دیکھن میں چلا، بُرا نہ مِلیا کوئے
جو من دیکھا آپنا، مُجھ سے بُرا نہ کوئے''

☆☆☆

ڈاکٹر سنتوش کمار جئے ہند
اکیڈیمک کونسلر (IGNOU)
دیال سنگھ کالج، دہلی یونیورسٹی
موبائل: 9717028565

## ایک اکیلا دو گیارہ

ایک شخص کے کئی لڑکے تھے جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ باپ نے کئی بار انہیں سمجھایا لیکن ان پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے انہیں سبق سکھانے کے لیے کہ اتحاد میں کتنی طاقت ہے، انہیں پتلی پتلی ٹہنیاں لانے کو کہا۔ تمام لڑکے گئے اور ٹہنیاں لے آئے۔ ان کے باپ نے ان ٹہنیوں کو ایک باندھ کر گٹھا بنایا اور لڑکوں سے کہا کہ وہ باری باری زور آزمائی کریں اور اس گٹھے کو توڑ دیں۔ ہر لڑکے نے اپنی اپنی جگہ بے حد زور آزمائی کی لیکن توڑنے میں ناکام رہے۔

اب اس نے اس گٹھے کو کھول کر ٹہنیاں علیحدہ علیحدہ کر دیں اور ایک ایک ٹہنی ہر ایک تھما کر توڑنے کو کہا۔ ہر لڑکے نے اپنے حصے کی ٹہنی آسانی سے توڑ دی۔ باپ نے کہا۔

''میرے بیٹو! غور سے سنو۔ اگر تم ان ٹہنیوں کی طرح اکٹھے رہو گے اور تم میں ایکا رہے گا اور اتحاد ہو گا۔ یک جان ہو کر زندگی بسر کرو گے تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ جو بھی اس حال میں تم سے لڑے گا، تم پر فتح نہ پا سکے گا۔ اگر تم علیحدہ علیحدہ رہو گے تو آسانی سے مارے جاؤ گے۔

**حاصل کلام:** اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ اتحاد کی بدولت کسی قوم کو بڑے سے بڑا دشمن بھی نیچا نہیں دکھلا سکتا۔

(حکایات سعدی)

مضامین

# جدید غزل کے بنیادی مبادیات

غزل ہر دور میں اردو کی ایک مقبول اور محبوب ترین صنف رہی ہے۔ حالانکہ غزل پر ہر دور میں بیش بہا تنقید ہوتی رہی۔ تنقید کے ایک طوفان بلاخیز کے باوجود بھی غزل کے اندر اتنی قوت اور توانائی تھی کہ اس کا بیڑا غرق ہونے سے رہ گیا۔ مخالف ہوائیں غزل کے چراغ کو کسی بھی سطح پر بجھانے سے قاصر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل آج بھی آسمان ادب پر پورے آب و تاب سے جلوہ گر ہو کر اپنی روشنی بکھیر رہی ہے۔

غزل اشعار کے ایک ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ ہم قافیہ ہو اور ہر شعر کا مطلب جداگانہ ہو یعنی ہر شعر اپنے آپ میں ایک اکائی ہو۔ ناقدین ادب نے عصر حاضر تک لکھے گئے غزل کے سرمایے کو دو بڑے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ کلاسیکی غزل اور جدید غزل۔ مطالعے کی آسانی کے لیے عموماً حالی سے پہلے لکھی جانے والی غزلوں کو کلاسیکی غزلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے غزل پر جو تنقید کی اور اعتراضات کا جو دائرہ کھینچا اس کے زیر اثر غزل میں جس طرح کی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں انہیں اصطلاحی دنیا میں عموماً جدید غزل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالی نے اپنی تنقیدی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں غزل پر جو اعتراضات قائم کئے اس کے ردعمل میں اردو غزل میں ایک واضح تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ غزل میں روایتی اور گھسے پٹے مضامین کی تکرار اور تنافر نے جو راہ لی تھی اسے غزل کو قدرے یکسر آزادی ملی۔ نئے منفرد، تر و تازہ اور متنوع قسم کے مضامین سے غزل کا دامن مالا مال ہونے لگا۔ اردو کے ایک جید اور مؤقر ناقد خلیل الرحمان اعظمی بھی اسی رائے سے اتفاق رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''چونکہ جدید غزل جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس غزل میں ہمیں ایک نئی فضا اور ایک نیا اُفق ملتا ہے۔ اس غزل میں پرانی علامتوں کی تکرار گھسے پٹے تلازموں کے بجائے تازہ تر علامتیں اور الفاظ کے نئے تلازمے ملتے ہیں۔ یہ الفاظ اور علامتیں ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔'' (خلیل الرحمان اعظمی، جدید تر غزل، مشمولہ ''جدیدیت: تجزیہ و تفہیم، مظفر حنفی (مرتب)''، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۶۹ء، ص ۳۹۶)

اس کے برعکس چند ایک ناقدین جدید غزل اس غزل کو کہتے ہیں جو ایک مخصوص سماجی صورتحال کی پیداوار ہے۔ جدیدیت کے بعد سماجی سطح پر ایک فرد ذاتی طور پر نئے تجربات اور احساسات سے ہمکنار ہوا۔ خوف، مایوسی، تنہائی، بے بسی، لاچارگی، بے گانگی، بے مقصدیت، بے معنویت وغیرہ جدید انسان کا گویا مقدر بن گئی۔ اس مجموعی صورتحال کے نتیجے میں سامنے آنے والی غزل کو ہی بعض ناقدین نے جدید غزل یا دوسرے معنوں میں نئی غزل سے تعبیر کیا ہے۔ جن میں وزیر آغا بھی سرفہرست ہیں۔ وہ جدید غزل کی تعریف کرتے ہوئے رطب اللسان ہیں:

''..... یہ مزاجاً بین الاقوامی ہے۔ انیسویں صدی کے برعکس جو انسان کے لئے تیقن اور اعتماد کا دور تھا۔ بیسویں صدی تشکیک، خود اذیتی اور گومگو کا زمانہ ہے۔ سائنس نے مادے کی ٹھوس حقیقت پر ضرب لگا کر اور آسمان کے حدود کو کئی گنا پھیلا کر انسان کی خود اعتمادی اور تیقن کو مجروح کیا ہے۔ اور دو عظیم جنگوں نے اس کے تہذیبی حصار میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ نتیجتاً انسان کا باطن ایک عجیب سی شکست و ریخت کی زد میں آیا ہے۔ تجریدی مصوری سے لے کر ٹوٹی پھوٹی ہوئی شاعری تک اور بیتی ازم سے لے کر ایل ایس ڈی کے استعمال تک شکست و ریخت تک کے سلاسل دراز ہوتے چلے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ذات کی نفی کا رجحان عام ہے اور اردو کی جدید غزل نے بھی اسے اثرات قبول کیے ہیں۔'' (وزیر آغا، اردو غزل، مشمولہ ''جدیدیت: تجزیہ و تفہیم، مظفر حنفی (مرتب)''، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۶۹ء، ص ۴۰۲)

غرض نئے انسان کی نئی زندگی کے بے شمار مسائل جدید غزل کا موضوع بنے۔ آج کا انسان جس غیر یقینیت اور غیر محفوظیت سے ہمکنار ہوا ہے اس کا برملا اظہار جدید غزل میں ہمیں واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ پرانے قدروں کی شکست و ریخت، سماجی استحصال کا احساس، سیاسی انتشار، اپنی ذات سے بے گانگی، تشخص کا بحران وغیرہ جیسے موضوعات جدید غزل میں ہمیں نت نئے طریقوں سے بار بار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر جدید غزل گو شاعر نے

مضامین

انفرادی سطح پر اس طرح کے موضوعات سے اپنی غزلوں کی خمیر تیار کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دل سلگتا ہے تیری چشم کرم کی چھاؤں میں
یہ زمین پیاسی بہت پیاسی بھرے ساون میں ہے
(محمود سعیدی)

بڑھتا رہا یوں ہی میرے اندر کا ریگ زار
شبنم کی یاد آئی تو کانٹوں پہ سو لیا
(مظفر حنفی)

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تاحد نظر ایک بیاباں سا کیوں ہے
(شہریار)

کرنا پڑے گا اب اپنے ہی سایے میں قیام
چاروں طرف سے دھوپ کا صحرا بچھا ہوا
(وزیر آغا)

جدید دور کے انسان نے ترقی کے بیش شمار منازل طے کردئے۔ آسمانوں پر اپنی کمند ڈال دی۔ زمینوں کے سینوں کو چیر کر اس کی گہرائی میں اتر گئے۔ اطلاعاتی تیکنالوجی نے فاصلوں کو سمیٹ کر پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا۔ لیکن ایسے میں انسان جس چیز سے دور اور بے گانہ ہوا وہ اس کی اپنی ذات ہے۔ اپنی ذات سے محرومی کا سفر انسان نے کب طے کیا اس کا صحیح اندازہ بھی اسے نہیں ہوسکا۔ جدید انسان اپنے ذات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ شاید یہی ہے کہ آل احمد سرور نے جدیدیت کی تعریف میں صرف اتنا کہا تھا کہ جدیدیت آدمی کی تلاش کا نام ہے۔ جدید دور کا انسان چہار سو کشمکش اور تضادات میں مبتلا ہے۔ ایسے میں اس کی ذات کا بٹوارہ بھی کئی خانوں میں ہوگیا۔ ذات کی اثبات اور نفی جدید غزل کا ایک بحث طلب موضوع رہا:۔

ہر ایک سمت مرے چیختا ہے سناٹا
ڈرا رہی ہے مجھے میرے خوف کی ڈائن
(محسن احسان)

ہر موڑ پہ اپنی ہی نفی کرتے ہوئے ہم
ہر سمت وہ آواز لگاتا ہے کہ میں ہوں
(مظفر حنفی)

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی
(شکیب جلالی)

میں اپنے آپ سے ڈر گیا تھا
گلی کا شور گھر میں آگیا تھا
(محمد علوی)

مضامین

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکس لا تفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے
(بانی)

میں اپنے جسم سے غائب رہا تھا یا حیرت
وہ کوئی دوسرا تھا جو میرے پیکر میں رہتا تھا
(مظفرحنفی)

آشوب آگہی ہے کہ تسخیر ماہتاب
انسان گرد بن کے خلاؤں میں رہ گیا
(فضاابن فیضی)

خلا میں سخت زمین نے تو مجھ کو پھینک دیا
اب اس جگہ سے مری لاش کو اچھالے کون
(زیبؔ غوری)

تین بڑے بنیادی اور مرکزی سطحوں پر جدید غزل نے اپنی ایک الگ شناخت اور انفرادیت قائم کی۔ سیاسی، سماجی اور فنی سطح۔ جدید غزل کی ایک بڑی اور واضح شناخت اس کی زبان اور اس کا فن ہے۔

ہر دور میں غزل کا محبوب ترین موضوع عشق رہا ہے۔ جدید غزل میں بھی عشق کے مضمون کو یکسر خارج نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کی مرکزیت کے پہلو بہ پہلو انسان نے دیگر احساسات اور جذبات کو بھی اولیت بخشی جو آج کے جدید انسان کے مسئلے ہیں۔ عشق کی دنیا میں اپنے آپ سے بے خود ہونے اور سماج و معاشرے کی تمام تر ذمہ داریوں سے راہ فرار ہونے کی جو حدت اور شدت روایتی غزل میں ملتی ہے وہ یہاں بالکل ناپید ہے۔ یہاں عشق کی گرمی اور سوز کے ساتھ ساتھ سماج و معاشرے کے ٹھوس حقائق اور کھردرے مسائل کی اور بھی شعراء کی نظریں براجماں ہیں۔ اس حوالے سے ممتاز الحق کی بات سے اتفاق کرنا لازمی بن جاتا ہے:

''روایتی غزل کے عشق کا جذبہ شدید اور ہنگامہ خیز تھا۔ وہ اپنے بہاؤ میں ہر شے کو بہا لے جاتا تھا اور عاشق پوری دنیا کو عشق کی نظر سے دیکھتا تھا۔ نئی غزل کا عاشق لازمی طور پر عشق پیشہ نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ عشق کا قحط ہے یا محبت کے نغموں کے لیے ابھی ماحول سازگار نہیں ہے یا محبت کو اس نے یکسر فراموش کر دیا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اب عشق کی خودمختاری ختم ہوگئی ہے اور اس کی شدت میں کمی آگئی ہے۔ عاشق عشق کے جذبے کے ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے مسائل پر غور وفکر بھی کرسکتا ہے اور دیگر مشاغل میں بھی شریک ہوسکتا ہے۔'' (ڈاکٹر ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی، سیاسی و سماجی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۵۸)

جدید غزل میں روایتی غزل کے برعکس جنسی مسائل کے واضح اظہار کو معیوب نہیں سمجھا گیا بلکہ اس کے اظہار اور ابلاغ کی مختلف صورتوں کو باعمل لایا گیا۔ روایتی غزل میں جنسی مسائل سے صرف نظر کرنے نے انہیں دیگر نفسیاتی الجھنوں میں ڈال دیا تھا جیسے امرد پرستی، گوشہ نشینی وغیرہ۔ ایسا نہیں کہ روایتی غزل میں صرف ستونتی تھی اور جنسی جذبات کے اظہار سے یکسر پاک تھی بلکہ اس میں بھی جنسی جذبات اور احساسات کا اظہار ملتا ہے لیکن آل احمد سرور کے بقول خوب صورت غلاف میں۔ اس کے برعکس جدید شعرا نے انسان کے اس جنسی جذبے کو ایک فطری تقاضے سے تعبیر کر کے اپنے کلام میں اس کا بے لاگ اظہار کیا۔ جدید غزل میں جس سطح پر جنسی مسائل کا کھل کر اظہار ملتا ہے اس سے بعض شعرا کا کلام بے اعتدالی کی حد کو بھی چھو گیا۔ ذیل میں

چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو
(خلیل الرحمان اعظمی)

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ سے
نرگس کے پھول چاند کی بانہوں میں چھپ گئے
(بشیر بدر)

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا
(حسن نعیم)

بھٹک جاتی ہے تم سے دور چہروں کے تعاقب میں
جو تم چاہو مری آنکھوں پہ اپنی انگلیاں رکھ دو
(زبیر رضوی)

آج کا دور عقلیت پرستی (Rationalism) کا دور ہے۔ عصر حاضر کی برق رفتار زندگی نے ایک انسان کو مشین کی طرح بنا کے رکھا ہے۔ یہاں جذبات کی اپیل بھی عقلی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ یہاں سطحی جذبات سے ایک انسان کو زیادہ مرعوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں روایتی غزل کے برعکس جذباتی تاویلات اور شاعرانہ توجیہات کے برخلاف منطقی استدلال اور معروضیت سے قاری کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ایسے میں بلاخوف وتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جدید غزل گوشعراء ذہنی طور پر حساس اور بیدار مغز ہے۔ اسی لیے وہ اندھی تقلید پرستی پر تشکیک اور مخمصے کو ہی ترجیح دیتا ہے۔ جدید غزل میں اسی لیے روایتی غزل کے برعکس فکر کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جدید شاعر نہ صرف یہ کہ روزمرہ زندگی کے مسائل اور الجھنوں سے واقف ہے بلکہ اس کی نظر عالمی سطح کے مسائل پر بھی برابر ہے۔ اسے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ پورے گلوب کی سطح پر اس کی بنیاد کہاں کھڑی ہے۔ وہ عالمی سطح پر تہذیبی ٹکراؤ اور انتشار کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی مسائل کا بھی درک رکھتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ آج کی مادی دنیا نے پوری دنیا کو ایک تجارت گاہ میں تبدیل کیا ہے۔ مادی اور سائنسی ترقی نے جہاں انسان کے سامنے آرام وآسائش کے نئے ابواب وا کیے وہیں قدرتی وسائل پر اجارہ داری کے ساتھ ساتھ اسے انگنت دیگر مسائل میں جھونک دیا: ؎

اب میں راشن کی قطاروں میں نظر آتا ہوں
کھیتوں سے بچھڑنے کی سزا پاتا ہوں
(بشیر بدر)

شکم کی آگ سے بڑھ کر کوئی وبال ہے کیا
ہمیں خبر ہی نہیں ہجر کیا، وصال کیا
(عالم خورشید)

یہ زندگی کا تقاضا ہے کچھ نہ اب سوچوں
ضمیر بیچ کے روٹی خریدنے نکلوں
(ظفر انصاری)

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آسکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کردیا

(پروین شاکر)

جدید غزل کی ایک بڑی منفرد پہچان اس کی زبان اور اسلوب بھی ہے۔ ایک طرف جہاں اس نے عام بول چال سے زبان سے اپنا بعد سمیٹ دیا وہیں دوسری طرف اس نے روایتی غزل کے بوجھل اور ثقیل اسلوب کے ساتھ ساتھ گھسی پٹی علامتوں، استعاروں اور تلازموں سے بہت حد تک کنارہ کشی اختیار کی۔ ایسے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جدید غزل نے اپنی دھرتی سے رشتہ استوار کردیا۔ وزیر آغا نے شاید اسی بات کی اور اشارہ کیا ہے:

''جدید دور سے قبل غزل نے صرف تلمیحات اور لفظی تراکیب کے سلسلے میں بڑی حد تک روایت کا ساتھ دیا تھا بلکہ زمین سے اپنی بندھن بھی مضبوط نہیں کئے تھے لیکن جدید دور میں غزل نے اپنی بھومی کو از سر نو دریافت کیا ہے اور اس کی اشیاء مظاہر اور ثقافتی ورثے سے اپنا تعلق قائم کیا ہے۔''

(وزیر آغا، اردو غزل، مشمولہ ''جدیدیت: تجزیہ و تفہیم، مظفر حنفی (مرتب)''، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۶۹ء، ص ۴۰۲)

جدید غزل کے شعراء نے اپنے آس پاس اور اردگرد کے ماحول سے نت نئی تشبیہات، استعارات اور تراکیب وضع کیں۔ نئی علامتوں کا بھی بہت زیادہ اضافہ جدید غزل میں دیکھنے کو ملا۔ سماجی علوم اور سائنسی علوم سے مستعار اصطلاحات اور تراکیب بھی جدید غزل کی زینت بن گئی۔ ہندوستانی موسیقی سے بھی جدید غزل نے زبان اور اسلوب کی سطح پر بہت حد تک اکتساب فیض حاصل کیا۔ زہر آلودہ طنز کے ساتھ ساتھ تیکھا اور نرم احتجاج بھی جدید غزل کی اسلوبی سطح پر ایک پہچان بن کے سامنے آئی۔ جدید غزل میں اظہار اور اسلوب کی سطح پر جو واضح اور نمایاں فرق دیکھنے کو ملی اس کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز الحق یوں رقمطراز ہیں:

''جدید غزل نے روایتی تلمیحات اور تشبیہات، علامات سے بڑی حد تک چھٹکارا پالیا ہے۔ نئے شاعروں نے محسوس کیا کہ علامت اور تلمیحات ان کے خیالات اور کیفیات کو پوری طرح ادا نہیں کرسکتیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنی نجی زندگی سے نئی علامتیں وضع کیں اور تشبیہ استعارے کے لیے بھی انہوں نے اپنی دھرتی کا رُخ کیا۔ ہمالیہ نے کوہ طور اور رادھا اور کنھیا نے لیلیٰ ومجنوں کی جگہ لے لی۔ صبر ایوب، حسن یوسف، کشتی نوح، خضر راہ وغیرہ ترکیبیں دستبردار ہوگئیں۔ رام، راون، بالی، کام دیو، سورج دیوتا، دیویاں، ساوتری، سیتا، پانی کا دیوتا، لکشمن ریکھا، ابھیمنو، گھنشیام، شکنتلا، کالا دیو وغیرہ دیسی علامتوں کے لیے نئی غزل میں راہ ہموار ہوئی۔ فرات اور جیجوں کی جگہ گنگا اور جمنا ندیوں نے لے لی......''

(ڈاکٹر ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی، سیاسی وسماجی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۳)

روایتی تلیحات کی جگہ اپنی تہذیب وثقافت سے نئی تلمیحات اور تراکیب وضع کرنا ایک اچھے اور جینوین شاعر کی پہچان ہوتی ہے۔ جدید غزل گو شعراء نے جہاں اسے اپنی ہمعصر زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اپنے کلام میں محفوظ کیا وہی دوسری سطح پر اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور زبان وبیان پر اپنی مضبوط گرفت کا بھی بیّن ثبوت پیش کیا۔ جدید غزل میں جو یہ زبان وبیان کی سطح پر واضح جدت دیکھنے کو میسر آئی اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

شیشے سے ڈھلا چوکا موتی سے چنے برتن
کھلتا ہوا ایک چہرہ ہنستے ہوئے سودرپن

(ندا فاضلی)

ایک پرندہ چیخ رہا تھا مندر کے مینار پر
دور کہیں گنگا کے کنارے آس کی سورج ڈھلتا ہے

(نور بجنوری)

عمیق چھیڑ غزل غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی جنوں خیز چودھویں شب ہے
(عمیق حنفی)

پیار کی آنکھیں مند جائیں گی، دل کا دیا بجھ جائے گا
کب تک لہو جلاؤ گے تم کب تک کاجل پارو گے
(سجاد باقر رضوی)

سن رے سجریا رس کی گگریا کل گاؤں کے میلے میں
دور دیس کا اک پردیسی تجھ پر تن من ہار گیا
(ناصر شہزاد)

جانے وقت کا ضدی بالک شور مچا کر کب سوجائے
آڑے غم محبوب میں تجھ سے پچھلے جنم کی بات کروں
(مظہر امام)

اس طرح جدید غزل میں الفاظ کی سطح پر ہندوستانی سماج اور تہذیب وثقافت در آئی۔ یہاں کے اعتقادات، رسوم ورواج، آرٹ، قانون، وغیرہ سے جدید غزل کے لفظوں کا خمیر تعمیر ہوا۔ من جملہ طور پر یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ جدید غزل میں الفاظ کی داخلی تفہیم دھیرے دھیرے بدل رہی ہے ساتھ ہی ساتھ نئے ذخیرۂ الفاظ کا اضافہ بھی مسلسل ہو رہا ہے جن کی اپنی ایک نئی معنویت اور نئی اشاریت ہے۔ واضح رہے کہ یہ تبدیلی ادبی سطح پر ایک خوش آئند بات کی ضامن ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر، استاد، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی۔ فون: 9541690559

مضامین

## وقت کی نزاکت

کسی مالدار بخیل کا بیٹا بہت سخت بیمار ہوگیا۔ دوا دارو کرنے کے باوجود بھی بخار کا زور نہ اترا تو کسی نیک دل شخص نے اسے مشورہ دیا کہ قرآن مجید ختم کراؤ یا بکرے کا صدقہ دو۔

یہ سن کر مالدار بخیل سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا۔ ''قرآن مجید ختم کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ منڈی دور ہے اور آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہوگا۔

اس کی یہ بات سن کر نیک آدمی نے کہا۔ ''قرآن مجید ختم کرنا اس لیے پسند آیا کہ قرآن اس کی نوک زبان پر ہے اور روپیہ اس کی جان میں اٹکا ہوا ہے۔

حاصل کلام: بخیل وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھنے کی بجائے ہمیشہ دولت کو دیکھتا ہے خواہ دولت نہ خرچ کر کے نقصان ہی اٹھانا پڑے۔

(حکایات سعدی)

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد



# اردو زبان کی بنیادی مہارتوں ( سننا، بولنا، پڑھنا، لکھنا ) کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال

**تلخیص:** زبان تعلیم کے حصول میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ زبان کسی بھی علم کو سیکھنے کا ذریعہ ہے۔ زبان سیکھنے کے عمل میں زبان کی مہارتیں اہم اور بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ زبان کی تدریس اور سیکھنے کے عمل میں بہت سے طریقہ کار موجود ہیں۔ ہر طریقہ ایک طرف حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور ایک خاص دور میں زبان کی تدریس اور سیکھنے کے مسائل کو مناسب طریقے سے قابو کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی خامیوں کو بھی اجاگر کرتا ہے جو ایک نئے طریقہ کار کے ظہور کا دروازہ کھولتے ہیں۔ چونکہ زبان کی تدریس ایک پیچیدہ عمل ہے اس لیے زبان تدریسی عمل کو مؤثر بنانے اور مہارت کے فروغ کے لیے مختلف طریقہ کار جیسے: لیکچر یا بیانہ طریقہ، سوال و جواب کا طریقہ، توضیحی و تشریحی طریقہ، گرامر ترجمے کا طریقہ، راست طریقہ، ڈالٹن پلان، غنائیہ طریقہ، آڈیو۔لسانی طریقہ، اور استقرائی و استخراجی طریقہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے زبان کے مطالعے کے محققین نے کئی ایسے طریقے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو زبان کی تدریس کو بہتر بنانے میں مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تعمیری طرز رسائی ہے جس کی اہمیت مسلم ہے۔ تعمیری طرز رسائی نے روایتی طریقہ کار کی پیچیدگیوں اور کمزوریوں سے نبرد آزما ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس کی بدولت آج کل معلم طلبا کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ اپنے تجسس کو مہمیز کریں اور روایت سے ہٹ کر سیکھنے اور فکر و عمل کا داعیہ پیدا کریں۔ اس مضمون میں اردو زبان کی بنیادی مہارتوں کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کے استعمال اور اس کی اہمیت اور مؤثریت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

**اہم نکات:** زبان کی مہارتیں، طریقۂ تدریس، زبان کی تدریس، تعمیری طرز رسائی۔

**تعارف:** موجودہ وقت میں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں برق رفتاری سے تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ وہیں تعلیمی شعبے میں مؤثر کن تبدیلیوں نے انقلاب برپا کر دیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ماہرین تعلیم کے بہت سے مکاتب فکر سامنے آئے اور انہوں نے سیکھنے کے مختلف نظریات پیش کیے۔ ہر نظریہ آموزش کی نوعیت و عمل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیکھنے کے نظریات اکتسابی عمل کو پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص تدریسی طریقہ کار کا جائزہ لینے کے لیے اقدامات بھی فراہم کرتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں جدیدیت کی بدولت طریقۂ تدریس بھی ارتقائی مراحل طے کر چکا ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں تدریسی اسلوب اور طریقۂ تدریس میں واضح اور نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ روایتی طریقۂ تعلیم نے جدید طریقۂ تعلیم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پہلے تدریس کے کرداری طرز رسائی کو بہتر سمجھا گیا، پھر وقوفی طرز رسائی نے اپنی معنویت کی بدولت کرداری طرز رسائی کی جگہ لے لی اور آج تعمیری طرز رسائی کو تدریس کے لئے مؤثر اور کارآمد تصور کیا جارہا ہے۔ کیونکہ موجودہ تعلیمی منظر نامہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ سیکھنا کوئی الگ تھلگ سرگرمی نہیں ہے۔ اس طرز رسائی کا تعلق بچوں کے خیالات اور ارد گرد کے ماحول سے ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خیالات، نظریات، تصورات اور تجربات جو ایک سیکھنے والے میں موجود ہیں سیکھنے کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ اس طرح سیکھنے والے کے لیے نئے علم کی تعمیر کے لیے سابقہ تجربہ اور پیشگی علم ضروری ہوتا ہے۔

**تعمیری طرز رسائی:** تعمیری طرز رسائی ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جو طلبا کو ان چیزوں کے ساتھ مربوط کر کے نئی تفہیم اور علم کی تشکیل کرتا ہے جو وہ پہلے سے جانتے ہیں۔ تعمیری طریقۂ اکتساب، سیکھنے کی سرگرمی سے متعلق مسئلے کے حل اور تنقیدی سوچ میں طلبا کی فعال شراکت پر مبنی ہے۔ طلبا اپنے سابقہ علم اور تجربے کی بنیاد پر نظریات اور نقطہ نظر کی جانچ کر کے انہیں نئی صورت حال پر لاگو کرتے ہیں۔ اور پہلے سے موجود دانشورانہ و فکری تجربات کے ساتھ حاصل کردہ نئے علم کو مربوط کرتے ہوئے اپنے علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ طلبا معلومات کو غیر فعال طریقے سے حاصل کرنے کے بجائے فعال طریقے سے خود علم کی تشکیل کرتے ہیں کیونکہ یہ طرز رسائی طلبا کو تعامل کرتے ہوئے خود سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

تعمیری طرز رسائی کی تعریف Fonsot نے کچھ یوں کی ہے، ”تعمیریت علم اور سیکھنے کے بارے میں ایک نظریہ ہے، جو یہ بیان کرتا ہے کہ 'جاننا' کیا ہے اور لوگ کیسے جانتے ہیں۔“

Airasian and Walsh کے مطابق ، ''تعمیر پسندی کی تعریف اس بنیادی مفروضے پر مبنی ہے کہ فرد اپنے موجودہ علم یا عقائد اور ان کے سامنے آنے والے نئے تصورات یا صورتحال کے درمیان تعامل کے ذریعہ علم کی تشکیل کرتے ہیں۔''

ان تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ تعمیری طرز رسائی اس نظریہ پر مبنی ہے کہ سیکھنے کا عمل کیسے ہوتا ہے۔ متعلم تدریسی عمل میں فعال طور پر شریک ہوتے ہیں اور سابقہ معلومات کی بنیاد پر نئے علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرز رسائی میں معلم ایک سہولت کار کے طور پر اکتساب کے لیے ماحول تیار کرتا ہے۔ معلم طلبا کی تنقیدی سوچ، تجزیہ اور ترکیب کی صلاحیتوں کی بنیاد پر سیکھنے کے پورے عمل میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرز رسائی میں معلم براہ راست ہدایت فراہم کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اور ہمیشہ نئے علم کی دریافت، تبادلۂ خیال، تحسین اور زبانی طور سے اپنے سوالوں اور سرگرمیوں کے ذریعہ طلبا کے سیکھنے کے عمل کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرز رسائی کی اہمیت کے پیش نظر قومی درسیاتی خاکہ (این سی ایف) -2005 نے بھی تعمیریت پر زور دیا ہے اور سیکھنے کے عمل میں تعمیری طرز رسائی کے استعمال کی سفارش کی ہے اور تدریسی عمل میں رٹنے کے رجحان کے بجائے تفہیم کے ذریعہ سیکھنے کی ایک مثالی تبدیلی کی تجویز پیش کی ہے۔ جس کے تحت تعلیم کو علم کی تشکیل وتعمیر کا عمل سمجھا جاتا ہے۔ قومی درسیاتی خاکہ نے ایسا نصاب تدوین کرنے پر زور دیا ہے جو سیکھنے والوں کو علم کی تشکیل کرنے میں مدد کرے اور علم کی تشکیل کے عمل کے سلسلے میں اساتذہ کے ذریعہ فعال کردار ادا کرنے پر توجہ مرکوز کرے۔ سیکھنے والے اکتسابی عمل میں فعال طور پر علم کی تشکیل کرتے ہیں جو تعمیری نظریہ کی جڑ ہے اور NCF-2005 کی بنیاد بھی یہی ہے۔ NCF-2005 مزید اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسکول کو طلباء کو استفسار کرنے، بحث کرنے، غور وفکر کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔

**تعمیری طرز رسائی کی خصوصیات:**

☆ تعمیری طرز رسائی علم کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ علم کی تشکیل کے عمل میں سابقہ علم، تجربات، سیکھنے والے کے عقائد اور رویوں پر غور کیا جاتا ہے۔

☆ تعمیری کمرہ جماعت طلبا پر مبنی ہوتا ہے اور اکتسابی عمل میں طلبا کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ سیکھنا طلباء کے سوالات اور دریافتوں پر مبنی ہوتا ہے۔

☆ تعمیریت کی بنیاد اس عقیدے پر مبنی ہے کہ علم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو محض کمرہ جماعت کے سامنے معلم کے ذریعہ طلبا کو دے دیا جائے بلکہ علم کی تعمیر و تشکیل سیکھنے والوں کے ذریعہ فعال شراکت اور ترقی کے ذہنی عمل کے ذریعے ہوتی ہے۔ سیکھنے والے خود معنویت اور علم کے معمار اور تخلیق کار ہوتے ہیں۔

☆ اکتسابی عمل کے دوران طلبا کو کس طرح سے سیکھنا ہے، اس کو جانتا اور سیکھتا ہے۔

☆ معلم کا کردار ایک گائڈ، مانیٹر، اور سہولت کار کا ہوتا ہے۔

☆ میٹا کوگنیشن، خود تجزیہ۔ ریگولیشن، عکاسی اور آ گاہی کی حوصلہ افزائی کے لئے سرگرمیاں، مواقع، آلے اور ماحول فراہم کئے جاتے ہیں۔

☆ تعمیری اکتساب قابل منتقلی ہوتا ہے۔ طلبا تعمیری کمرۂ جماعت میں سیکھنے والے تنظیمی اصولوں اور ذہنی نمائندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ جسے وہ پنی حقیقی زندگی کے دیگر سیکھنے کی ترتیبات میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

☆ تعمیریت سوچنے، غور وفکر کرنے اور سمجھنے کے طریقے پر مبنی ہے۔ مسئلہ حل کرنے، تخلیقی اظہار، اعلیٰ درجے کی سوچ کی مہارت، اور گہری سمجھ بوجھ اور فہم پر زور دیا جاتا ہے۔

☆ محرکہ سیکھنے کے عمل میں ایک اہم نکتہ ہوتا ہے۔

☆ تعمیری کمرہ جماعت میں ایسا ماحول بنایا جاتا ہے جو سماجی اور مواصلاتی مہارتوں کو فروغ دینے پر مبنی ہوتا ہے جو تعاون اور خیالات کے تبادلے پر زور دیتا ہے۔

☆ طلبا یہ سیکھتے ہیں کہ گروپ پروجیکٹس میں اشتراک کر کے اپنے خیالات کا واضح اظہار کیسے کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ کاموں میں مؤثر طریقے سے

آپسی تعاون کیسے کیا جائے۔ وہ خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں، اور دوسروں کے ساتھ 'بات چیت' کرنا سیکھتے ہیں اور سماجی طور پر قابل قبول طریقے سے ان کے تعاون کا جائزہ لیتے ہیں۔

☆ غلطیاں طلبا کے سابقہ علمی تشکیل کے بارے میں بصیرت کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

☆ سیکھنے والے کو متبادل نقطۂ نظر سے روشناس کرانے کے لئے باہمی تعاون اور تعاون پر مبنی اکتساب کو ترجیح دی جاتی ہے۔

☆ طلبا کی صلاحیت کو بروئے کار لانے اور ان کی لیاقت کے مطابق کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں مدد کرنے کے لئے scaffolding کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ scaffolding طلبا کی قابلیت کو بڑھانے اور معلم کی رہنمائی کو کم کرنے کی تکنیک ہے۔

☆ اکتسابی عمل میں جانچ کا عمل مستند ہوتا ہے اور تدریس کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ تعمیری انداز کے جانچ کی تکنیک کے ذریعہ طلبا تخلیقی اظہار میں خود کو مشغول رکھتے ہیں، جو ان میں مختلف طریقوں سے علم کے اظہار کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

**اردو زبان کی بنیادی مہارتیں اور تعمیری طرز رسائی:** آج کی دنیا میں، زبان زندگی بھر سیکھنے اور ترقی کا سب سے اہم پہلو ہے، کیونکہ موجودہ دور علمی انفجار کا دور ہے اور ہم معلومات کے دور کا تجربہ کر رہے ہیں۔ مختلف سرگرمیاں جیسے پڑھنا، لکھنا، سوچنا، مسئلہ حل کرنا، سوال کرنا اور سمجھنا سبھی زبان کی مہارت کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ زبان ذہنی، جذباتی اور سماجی ترقی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ مواصلات کو قائم کرنے، احساسات اور خیالات کا اظہار کرنے، بیرونی دنیا کے ساتھ انضمام، ثقافت کی منتقلی اور لوگوں کے ساتھ بات چیت جیسے عمل میں اس کا اہم مقام ہے۔ زبان افراد کی مختلف خصوصیات مثلاً صلاحیتوں کو بہتر بنانا، پیچیدہ مسائل کو حل کرنا، سائنسی مزاج، مختلف اقدار کا حامل ہونا اور وسیع تر عالمی نظریہ کو متاثر کرتی ہے۔ یہ صورت حال ظاہر کرتی ہے کہ زبان کی مہارتوں کو زندگی بھر کی بنیاد پر تیار کیا جانا چاہیے، اور زبان کی نشوونما صرف اسکول میں پڑھائی جانے والی چیزوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے، بہت سے ممالک لوگوں کی زبان کی مہارت کو فروغ دینے کے لیے نئے طریقوں اور حکمت عملیوں کے استعمال میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ (Gunes, 2011) زبان سیکھنا فکری و اکتسابی عمل ہے۔ چاہے وہ مادری زبان یعنی زبان اول ہو، دوسری ہو یا تیسری زبان۔ زبان کو بطور زبان اور ذریعہ تعلیم دونوں طور سے سیکھا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی تدریس بحیثیت زبان اول یا مادری زبان کے بھی کی جاتی ہے اور زبان زائد کی حیثیت سے بھی کی جاتی ہے۔ زبان کی تدریس کے لیے ماہرین تعلیم نے متعدد طریقے وضع کئے ہیں۔ جن میں لیکچر یا بیانہ طریقہ، سوال و جواب کا طریقہ، توضیحی و تشریحی طریقہ، گرامر ترجمے کا طریقہ، راست طریقہ، ڈالٹن پلان، غنائیہ طریقہ، آڈیو-لسانی طریقہ، اور استقرائی و استخراجی طریقہ کار شامل ہیں۔ ہر طریقۂ تدریس زبان یا سیکھنے کے عمل کو سمجھنے کے ایک خاص وژن پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر طریقہ کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور یہ مخصوص تکنیکوں اور مواد کے ساتھ ایک ترتیب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ طریقے دوسرے طریقوں کے مقابلے میں سیکھنے والوں کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے متعدد طریقۂ تدریس اور حکمت عملیاں منظر عام پر آئی ہیں، جو موجودہ دور کی ضرورتوں اور تقاضوں سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اس لئے ماہرین نے زبان کی تدریس میں جدید طریقوں اور حکمت عملیوں کے اطلاق پر زور دیا ہے۔ جو کمرہ جماعت کی تدریس کو عملی اور بامعنی بنانے کو یقینی بنا سکے تاکہ طلبا کی شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما ممکن ہو سکے۔

**سننے کی مہارت کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال:** زبان کی چاروں مہارتوں میں سننا نہ صرف سب سے اول ہے بلکہ سب سے اہم بھی ہے۔ (Vandergrift, 2004,) نے سننے کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے سب سے مشکل مہارت کے طور پر تشکیل دیا ہے۔ عام سننے کی مہارت معنی کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ (رچرڈز، 2008) کے مطابق ''فہم کے طور پر سننے کا نقطہ نظر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ سننے کا مقصد پیغامات سے معنی اخذ کرنا ہے''۔ چونکہ یہ نقطہ نظر طلبا کو مؤثر سامعین بننے کے لیے رہنمائی کرنے کی ضرورت کی وکالت کرتا ہے۔ اس لیے مہارتِ سماعت کی نشوونما کے لئے ایک معلم کمرۂ جماعت میں بہت سے آلات، تدابیر اور وسائل کا استعمال کرتا ہے۔ سننے کی مہارت کو فروغ دینے کے لئے تعمیری طرز رسائی کی مختلف حکمت عملیوں اور

سرگرمیوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے:

☆ اس طریقہ میں سبق کی ابتداء فیس شیٹ ریڈنگ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے تصاویر یا چارٹس کا استعمال طلبا کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی جانب توجہ مبذول کرنے کا ماموثر ذریعہ ہوتی ہیں۔ ان تصاویر یا چارٹس کے متعلق تمام طلبا سے باری باری ان کے تصورات کے بارے میں معلم پوچھتا ہے۔ ان تصاویر کے متعلق تمام طلبا اپنے تصورات کو ظاہر کرتے ہیں۔ مختلف تصورات کو سن کر معلم انہیں ایک ترتیب کے ساتھ یکجا کرتے ہیں۔ ان تصوراتی جملوں کو ترتیب وار لکھ کر طلبا سے عنوان اخذ کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تصویر میں نظر آنے والی سرگرمیوں کو واضح کرنے کے لئے طلبا سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ طلبا سے سوالات کرنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طلبا غور سے سن رہے ہیں یا نہیں۔ سماعت کے عمل کا سب سے اہم جز توجہ کی مرکوزیت ہوتی ہے۔ معلم طلبا کے ذریعہ دیئے گئے جوابات کو تختہ سیاہ پر لکھتے جاتے ہیں، پھر ان جملوں کو ترتیب وار لکھ کر عنوان اخذ کرتے ہیں۔ یہ عمل طلبا کی سننے کی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔

☆ تعاونی اکتساب یا گروہی سرگرمیوں کے ذریعہ مختلف موضوعات پر گفتگو و بحث ومباحثہ کے دوران تمام طلبا مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یہ عمل طلبا کو ایک دوسرے کی باتوں کو سننے، اور فہم پیدا کرنے، اس پر اتفاق یا اختلاف کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب طلبا ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے اور سمجھتے ہیں اور مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یہ عمل طلبا کی قوت سماعت کو بڑھاتے ہیں۔

☆ موضوع کی مناسبت سے تصاویر، چارٹس اور مناسب ماڈلس کی پیش کشی بھی طلبا کی توجہ، دلچسپی اور تجسس پیدا کرنے اور ان کی حس کو متحرک رکھنے کا مؤثر وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔ مثالوں اور تشبیہات کے لیے سمعی و بصری وسائل کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اس سے طلبا میں مزید سننے اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

☆ کمرہ جماعت کے اندر ہر طالب علم کو باری باری سبق کی بلند خوانی کا موقع دینا چاہیے۔ بلند خوانی کے ذریعہ طلبا کو دقیق اور مشکل الفاظ کے تلفظ کی سماعت ان میں ادراک و فہم اور ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اس سے طلبا کی سماعت کے نقص پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔

☆ کہانی، زبان سے متعلق مختلف کھیلوں اور گیت کے ذریعہ بچوں کو سکھانا چاہیے کیونکہ یہ بچوں کی فطرت میں شامل ہوتا ہے اور بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ تعمیری طرز رسائی میں بچوں کی نفسیات پر توجہ مرکوز کرنا ایک اہم نکتہ ہے۔ بچے وہی کرنا چاہتے ہیں جس میں ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ سماعت کو فروغ دینے کے لئے دلچسپ کہانیاں اور بزرگوں کے واقعات سنائیں۔ کہانی سنانے کے بعد ان سے اس کہانی کے کردار، واقعات اور اس کہانی سے ملنے والے سبق سے بحث بھی کی جانی چاہیے۔

☆ سبق کی تفہیم اور طلبا کی توجہ کی مرکزیت جانچنے کے لئے معلم کو دوران تدریس طلبا سے سوالات پوچھنا چاہیے۔ اور تصورات کی بہتر تفہیم کے لیے چھوٹی چھوٹی مثالیں پیش کی جانی چاہیے۔ اس سے تفہیم سبق کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور طلبا کے اندر سبق کے تئیں دلچسپی اور توجہ کو بھی مرکوز کیا جا سکتا ہے۔

☆ طلبا سے مختلف سرگرمیوں جیسے کہانی یا واقعات کو سن کر اپنے الفاظ میں ان کے نتائج و خلاصہ اخذ کرنا، گروہی سرگرمیوں کے نتائج کو سن کر اس کے نوٹس بنانا، معلم کے ذریعہ پڑھائے گئے سبق کو سن کر اس کا خلاصہ پیش کرنا، یہ تمام عمل طلبا کے اندر سمعی مہارت کو فروغ دینے میں معاون ہوتے ہیں۔

☆ آئی سی ٹی جو تعمیری طرز کے اکتساب کو فروغ دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ طلبا کو مختلف طریقوں سے سیکھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ آئی سی ٹی نے مشترکہ سیکھنے کی تکنیکوں کو مربوط کیا ہے۔ معلم کمرہ جماعت میں آڈیو ٹریک کے استعمال کے ذریعہ کوئی کہانی، بزرگوں کے واقعات، گیت، نظم یا شاعری، مختلف موضوعات پر تقاریر سنا کر طلبا سے اس کے متعلق سوالات پوچھ سکتے ہیں۔ جو طلبا کی توجہ کو بغور سننے کی طرف مبذول کراتا ہے۔ اسی طرح ویڈیو کے استعمال کے ذریعہ سبق کی مناسبت سے کوئی ڈاکیومنٹری، ڈرامہ، کوئز پروگرام دکھا کر طلبا میں سماعت کے فروغ کے ساتھ ساتھ بہترین ذہنی نشونما بھی کی جا سکتی ہے۔

**بولنا/ تکلم کی مہارت کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال:** بولنا ایک تعاملی عمل ہے جہاں معلومات کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ تکلم شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیونکہ گفتگو/ تکلم سے کسی بھی فرد کے خیالات اور معلومات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک گرائمر۔ ترجمے کے طریقہ کار کی توسیع اور راست طریقہ وآڈیو۔ لسانی طریقہ کے متعارف ہونے کے دوران بولنے کی مہارت کی تدریس کو اس وقت تک اہم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد سے، بولنے کی مہارت کی تدریس پر ایک بہت ہی عام توجہ سیکھنے والوں کے بولنے کے لیے کمرہ جماعت کی بہتر حالات قائم کرنے پر رہی ہے۔ یہ نظریہ عام طور پر دیگر زبانوں کے حصول اور تعلیمی وسماجی نفسیات پر مبنی ہے۔ لسانیات کے اساتذہ اکثر طلبا کے اندر دلچسپی اور بولنے کی مہارت پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقے جیسے اخبارات، رسائل، اور دیگر ذرائع کا استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ آج بھی مختلف زبانوں کی تدریس کے لئے کمرہ جماعت میں رائج ہیں۔ لیکن یہ لسانی مہارتوں کو فروغ دینے میں پورے طور پر کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ بولنے کی مہارت کے فروغ کے لئے تعمیری طرز رسائی کی حکمت عملیوں کو بروئے کار لاکر بہتر بنایا جاسکتا ہے کیونکہ یہ تدریس کے لیے مناسب ماحول فراہم کرنے اور تدریس کے تمام مراحل میں طلبا کی شراکت پر زور دیتا ہے:

☆ سبق کی شروعات کرنے کے لئے یا عنوان اخذ کرنے کے لئے معلم کسی کہانی کو سنا کر، یا تصویر دکھا کر طلبا سے اس کے بارے میں اندازہ لگانے اور اظہار خیال کرنے کو کہہ سکتے ہیں۔ جس سے طلبا کو بولنے کا موقع فراہم ہوگا۔ اس کے علاوہ درسی کتاب میں شامل کہانیوں کو پڑھاتے وقت طلبا سے کہانی کے درمیان میں یا کسی اور موضوع کے بارے میں بیان کرتے وقت ایک دو جملے سنانے کے بعد کہانی یا اس سبق میں آگے رونما ہونے والی بات یا واقعات کے بارے میں اندازہ لگانے کے لئے آمادہ کرنے سے طلبا کے اندر قوت تخیل اور ان کے جذبات وخیالات میں تسلسل کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

☆ مخصوص عنوان کے تحت 'برین اسٹارمنگ' کے ذریعہ طلبا کو اس عنوان کے متعلق ان کے خیالات وتصورات کے اظہار کرنے کا موقع فراہم کرنے سے مختلف آراء اور تصورات سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرد کی اپنی انفرادی سوچ ہوتی ہے۔ طلبا کو ہر ایک کے نقطہ نظر کو جاننے کا موقع ملتا ہے جو ان کے قوت متخیلہ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ جو ان کے بولنے کے لیے اساس فراہم کرتا ہے کیونکہ جیسا وہ سوچتے ہیں ویسا ہی بولتے ہیں۔

☆ گروہی سرگرمی کے دوران اسباق کے موضوعات پر بحث ومباحثہ کے ذریعہ طلبا کے اندر آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ معلم کے ذریعہ طلبا کی خوبیوں کی تائید اور حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اس سے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو ان کے اندر محرکہ کا کام کرتی ہے۔

☆ تدریس کے دوران طلبا سے سبق سے متعلق سوال وجواب کے ذریعہ طلبا کے اندر صحیح تلفظ، روانی کے ساتھ بولنے کی تربیت دی جاسکتی ہے۔

☆ جیروم برنر، جو زبان سیکھنے کے لیے تعمیری نظریہ کو وضع کرنے میں سب سے نمایاں طور پر وابستہ ہیں۔ وہ زبان سیکھنے کے لیے اظہار خیال کرنے اور مؤثر طریقے سے تعامل کرنے کو اہم مانتے ہیں۔ اس حوالے سے طلبا کو درسی کتاب میں شامل کہانی، نظم یا ڈرامے کے مرکزی خیال وسبق کے خلاصے کو بیان کرنے یا موضوع سے ملتے جلتے ان کی کسی سنی یا پڑھی ہوئی کہانیوں کو اپنے لفظوں میں سنانے کا موقع دیا جانا چاہیے اس سے ان کے تخیل کی مشق ہوتی ہے اور ان کے تصورات میں پختگی پیدا ہوتی ہے جو انہیں اچھی گفتگو سیکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

☆ تعمیری طرز رسائی کے ذریعہ تنقیدی سوچ اور مسئلہ کے حل کی صلاحیت کا فروغ بھی شامل ہوتا ہے۔ سبق کے عنوان کی مناسبت سے یا کہانی میں آنے والے حالات کے متعلق مختلف صورت حال پیدا کر کے جیسے کہ '' آپ کا ایک دوست حال ہی میں سڑک حادثے کا شکار ہوگیا تو اپنے ساتھی کے مسئلے اور سڑک کے حفاظتی اصول پر عمل کرنے کی ترغیب دینے کے طریقوں پر بات کرنے کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ اس سے طلبا میں بولنے کی صلاحیت پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل، تنقیدی سوچ اور مثالی کردار ادا کرنے کی صلاحیت کا فروغ ہوتا ہے۔

☆ یہ طرز رسائی سرگرمی مرکوز ہونے کے باعث تدریس کے ہر مرحلے میں طلبا کی شراکت کو یقینی بناتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل اور بولنے کی مہارت کے فروغ کے لئے نصاب میں شامل ڈرامے کو طلبا کے ذریعہ کمرۂ جماعت میں عملی انعقاد اور اداکاری کا موقع فراہم کر کے مختلف مکالموں کو صحیح اور موقع کی

مضامین

مناسبت سے ادا کرنے کی صلاحیت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔اور طلبا سے مختلف مکالموں کی مشق کرا کے ان کے اسلوب بیان کو معیاری بنایا جاسکتا ہے۔

☆ کمرہ جماعت میں طلبا کو مختلف شخصیات جیسے: ڈاکٹر، معلم، جج، دکاندار، سیاست دان وغیرہ کا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ چونکہ رول پلے میں کردار کو اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور مکالموں کی ادائیگی میں مہارت سے کام لینا ہوتا ہے۔رول پلے میں جسمانی حرکات اور اظہارِ جذبات کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔اس طرح کردارنگاری کے ذریعہ طلبا کے اندر مافی الضمیر کے اظہار کی صلاحیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

☆ اسی طرح کمرہ جماعت میں طلبا کو مختلف موضوعات پر تقریر کرنے کا موقع فراہم کرنے سے طلبا کے اندر عمدہ انداز بیان، مناسب جملوں کے مؤثر استعمال، روانی کے دوران وقفہ، صحیح تلفظ اور روانی کے ساتھ بولنے کی مہارت اور اپنے مافی الضمیر کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت کا فروغ دیا جاسکتا ہے۔

**پڑھنا/مطالعہ کی مہارت کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال:** زبان کی تدریس میں پڑھنے کا عمل مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔بات چیت کرنے کا طریقہ سکھانا یا سیکھنا اکثر بولنا سکھانے یا سیکھنے سے وابستہ ہوتا ہے۔کسی کی بات چیت کی صلاحیت کو بڑھانے میں پڑھنے کی مہارت کے کردار کو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا ہے۔ایک مفروضہ کہ پڑھنا کسی کی بولی اور تحریری مواصلات کی مہارت کو بڑھا سکتا ہے، تحقیق اور کئی تجرباتی کاموں سے ثابت کیا گیا ہے۔مختلف سیاق وسباق میں پڑھنے کی مہارت کی تدریس وفروغ کے لسانیات کے اساتذہ گرامر۔ترجمہ، فہم کے سوالات، زبان کے متعلق کام، وسیع مطالعہ، مہارت پر مبنی مختلف مقبول حکمت عملیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن طلبا کی پڑھنے کی مہارت کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتا ہے:

☆ درسی کتاب کے اسباق میں شامل شدہ تصویر جو متن کی نمائندگی کرتی ہیں وہ طلبا کو متن کو ڈی کوڈ کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔اسی طرح معلم کو چاہیے کہ سبق/عنوان کی مناسبت سے دوران تدریس چارٹ اور تصاویر کا استعمال کرے جو طلبا کو متن کے تصورات کی تفہیم اخذ کرنے میں معاون ہوسکتی ہیں۔یہ صلاحیت انہیں دیگر تحریروں کو پڑھ کر مفہوم سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔

☆ درسی کتاب کے اسباق کی عبارت خوانی، متن کے اہم نکات اور مرکزی خیال کو بیان کرنے کی سرگرمی کے ذریعہ طلبا کے اندر تنقیدی سوچ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عبارت کے معنی ومفہوم کو سمجھنے کی مہارت پیدا کی جاسکتی ہے۔

☆ معلم کے ذریعے پڑھائے گئے سبق یا کسی تحریر کے فہم وادراک کی جانچ کے لئے جو سوالات کئے جاتے ہیں وہ بھی طلبا کے پڑھنے کی مہارت کو بہتر بناتے ہیں اس لیے معلم کو دوران تدریس وقفے وقفے سے سوالات کیے جانے چاہئیں۔

☆ کسی تحریر کو مماثل تصاویر یا چارٹ سے جوڑنے کی مشق سے طلبا میں تحریر کے ساتھ دی گئی علامات یا تصاویر کو تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور اس کا ماخذ حاصل کرنے کی قابلیت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ طلبا کی معیاری بلند خوانی کے ساتھ کسی تحریر کو پڑھنے سے تلفظ کی اصلاح، الفاظ اور جملوں کو بولنے کی صحیح صلاحیت کی نشوونما اور آواز کے صحیح اتار چڑھاؤ کی مشق کرائی جاسکتی ہے۔

☆ جب معلم سبق کی بلند خوانی کرے یا کسی جملے یا الفاظ کو پڑھے تو طلبا کو بھی ساتھ میں مشق کروانے سے طلبا میں تحریر کو صحیح تلفظ، مناسب لب ولہجہ، رفتار اور رموز واوقاف کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

☆ کمرہ جماعت میں وقتاً فوقتاً کسی مسئلے یا تعلیمی نکات پر بحث ومباحثہ کا اہتمام کیا جانا چاہیے اس سے طلبا کو اپنے خیالات اور جذبات پیش کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔اس سے کمرہ جماعت میں سیکھنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ طلبا کی استدلالی قوت اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کرنے کی صلاحیت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

☆ کہانی وکھیل کے ذریعہ سیکھنا بچوں کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔اس لیے طلبا کو مختلف عنوان دے کر کہانی سنانے کے ترغیب دی جاسکتی ہے اور نامکمل کہانی کو مکمل کرنے کی سرگرمی کے ذریعہ ان کے اندر مزید مطالعہ کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

☆ پروجیکٹ طریقہ کار کے تحت طلبا کو دو گروہ میں تقسیم کر کے ان سے الگ الگ مقامات کی سیر وتفریح اور اس کی رپورٹ تیار کرنے ،طلبا کو اپنے اسکول میں ایک صفائی مہم کے تحت ساری سرگرمیوں کی رپورٹ تیار کرنے جیسا منصوبہ دے کر ان کے اندر مل جل کر کام کرنے ،معلومات اکٹھا کرنے ،معلومات کو منظم کرنے اور خود اعتمادی کا فروغ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سارا عمل طلبا کے اندر فکر انگیز مطالعہ کی عادت پیدا کرتا ہے۔

☆ کوآپریٹو لرننگ جو کہ اپنے تجربے کی بنیاد پر گروپ میں کسی چیز پر بحث کر کے سیکھنے کا عمل ہے۔موضوع کی مناسبت سے معلم کو اس تکنیک کا استعمال کیا جانا چاہیے۔جیسے کمرہ جماعت کو مختلف گروہ میں تقسیم کر کے کسی مشہور شاعر کی زندگی پر تحقیق کا کام دیا جاتا ہے۔ ہر گروہ کی اس شاعر کی زندگی کے ایک مخصوص حصہ کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔ جب طلبا کا گروہ اپنی انفرادی کام کو مکمل کر لیتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے اپنی معلومات کا اشتراک کرتے ہیں۔اس سے طلبا کے اندر مواصلات کی مہارت ،ذاتی ذمہ داری کا احساس ،خود اعتمادی ،ہم رفقاء کے ساتھ مثبت رویہ کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ساتھ ہی ان کے اندر مزید مطالعہ کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

**لکھنا/ تحریر کی مہارت کے فروغ میں تعمیری طرز رسائی کا استعمال:** لکھنا زبان کی مہارتوں میں سب سے پیچیدہ عمل ہے۔تحریر میں دیگر تین عناصر سننا، بولنا اور پڑھنا بھی شامل ہیں۔لکھنا تخلیقی وتہذیبی زندگی کا مظہر اور شخصیت سازی کا ایک جوہر ہے۔اسی لئے تحریری نشو ونما زبان کی تدریس میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ طلبا کو اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے قابل بناتی ہے۔ لکھنے کی مہارتیں طلبا کو صحیح پیغام ،احساسات ،خیالات ،اور تجربات کو تحریری شکل میں پیش کرنے میں مدد کرتا ہے۔تحریر فکر کو منظم کرنے کا ایک مفید ذریعہ ہے۔تحریری تدریس کے لئے پروسیس اور پروڈکٹ دو اہم طریقہ کار ہیں۔لکھنے کے لیے پروڈکٹ اپروچ تب مؤثر ہوتا ہے جب متن پڑھنا مقصود ہو۔جس کا ایک مقررہ فارمیٹ ہوتا ہے۔ لکھنے کے پروسیس اپروچ کا استعمال ایسے طلبا کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی پہلی زبان اسکول کی ذریعہ تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔لکھنے کی مہارت کے فروغ میں ان دونوں طریقہ کار کا استعمال ہر طرح کی صورت حال میں کرنا موزوں نہیں ہے۔خود اکتساب کے نظریہ پر مبنی تعمیری طرز رسائی کے مختلف حکمت عملیوں کا استعمال معلم طلبا کے اندر لکھنے کی مہارت کو بہتر کر سکتا ہے:

☆ دوران تدریس طلبا سے سوالات وجواب کی کاروائی ،اور فیس شیٹ ریڈنگ مرحلے کے ذریعہ جو مختلف تصورات نکل کر سامنے آتے ہیں جس کی بنیاد پر معلم عنوان کو اخذ کرتا ہے اور تدریس کو آگے بڑھاتا ہے۔اس سے طلبا کے اندر اپنے تخیلات کے اظہار کا موقع ملتا ہے' جو اُن کو لکھنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

☆ مختلف موضوعات پر طلبا سے اپنے خیالات کا اظہار جیسے ذاتی تجربات کو بیان کرنے ،اپنا ردعمل ظاہر کرنے اور سوالات پوچھنے کا موقع فراہم کرنے سے ان کی فکر وخیال کو وسیع کیا جاسکتا ہے' جو تحریر کے لیے اساس فراہم کرتا ہے۔

☆ تعمیری طرز رسائی کی ایک اہم سرگرمی ذہنی خاکہ ہے جو ایک تخلیقی اور منطقی طریقہ ہے۔ یہ طلبا کے خیالات کو خاکہ کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔اس کے ذریعہ مختلف عنوانات کے تحت جملوں/ معلومات کو مربوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سرگرمی طلبا کے اندر مختلف اراء کو منظم کرنے اور دیئے گئے عنوان کے مرکزی خیال کی وضاحت کا موقع فراہم کرتا ہے' جو اُن کے اندر لکھنے کی مہارت میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

☆ طلبا کو اپنے پسند کی چیزوں کے بارے میں تفصیلات لکھنے کا موقع دینا یا مختلف موضوعات پر اظہار خیال کا موقع دینے سے بھی ان میں تحریری مہارت کا فروغ کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ تعمیری طرز رسائی میں تخلیقیت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

☆ سبق کی تدریس کے دوران آنے والے مشکل الفاظ کی مشق کروانے ،اس کے مترادف الفاظ بتانے اور ان کو جملوں میں استعمال کرنے اور اس کی

مضامین

وضاحت کرنے سے طلبا کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ پر دسترس طلبا کو مزید دلچسپ جملے بنانے اور اقتباس میں ایک ہی الفاظ کی تکرار سے بچنے اور متبادل اصطلاحات استعمال کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

☆ مختلف طرح کی سرگرمیاں جیسے: جملہ بندی، پیراگراف لکھنا، خلاصہ نگاری، کہانی نویسی، ان کے پسندیدہ اشعار کی تشریح، نظم نگاری، مضمون نویسی، خطوط نویسی، کویز مقابلہ اور روداد نویسی جیسی سرگرمیوں کا انعقاد طلبا کے اندر مؤثر انداز بیان اور اپنے خیالات و جذبات کو صحیح ترتیب اور منظم طریقے سے پیش کرنے کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرتا ہے۔

☆ انکشافی طریقے کے تحت طلبا کو مختلف عملی سرگرمی جیسے اپنے آس پڑوس یا جاننے والے کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں معلومات جمع کرنا، دیگر مذاہب کے تہواروں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا، اپنے اطراف میں ہونے والے مختلف مواقع کی رسومات کے بارے میں معلومات جمع کرنا یا کسی سیاسی رہنما کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور اس کی کمرہ جماعت میں پیش کشی سے طلبا کے اندر صفائی اور درستگی کے ساتھ لکھنے کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

**اختتامیہ:** تعلیم کے حصول میں زبان کی مرکزی حیثیت ہے اور دیگر مضامین کو سیکھنے کا وسیلہ ہے۔ چونکہ اردو زبان موجودہ دور کی ترقی یافتہ اور کثرت سے بولی جانے والی زبان ہے اور بہت سے طلبا اسے بحیثیت مادری زبان یا زائد زبان کی حیثیت سے بھی سیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس زبان کو اس طرح سے سکھایا جائے کہ یہ نہ صرف، سننے اور پڑھنے میں طلبا کی مدد کرے بلکہ بولنے، لکھنے اور دوسروں کے ساتھ بات چیت کرنے میں بھی مدد کرے۔ تعمیری طرز رسائی جو زبان کی تعلیم میں عمل اور تعاون پر مبنی اکتساب، کلاس روم کے تخلیقی کام، اور پروجیکٹ کی تکمیل پر مبنی ہے۔ اس سے طلبا کو تیز رفتار اور مؤثر، دلچسپ اور انٹرایکٹو طریقے سے سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ چونکہ یہ خود اکتساب اور طلبا کی عملی شراکت پر زور دیتا ہے اس سے طلبا بغیر بوجھ کے دلچسپی کے ساتھ اکتسابی عمل میں شریک ہوتے ہیں اور سابقہ تجربات کی اساس پر علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ معلم اس طریقہ کار کا استعمال کے ذریعہ ایسی عادت کو فروغ دیتا ہے کہ طلبا از خود اکتسابی عمل میں شامل ہوتے ہیں اور مشکل سے مشکل تصورات کی تفہیم کر لیتے ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات ہے کہ معلم زبان کی تدریس میں، روایتی طریقوں کو چھوڑ کر تعاونی اکتساب، بحث و مباحثہ، مسئلے کا حل، گروہی سرگرمیاں، انکشافی طریقہ اور ذہنی خاکہ جیسے دیگر اختراعی حکمت عملیوں کو مؤثر طریقے سے استعمال کرے، تاکہ طلبا کی زبانی مہارت کے فروغ کو ممکن بنایا جاسکے۔

☆☆☆

شبانہ معظم
(ریسرچ اسکالر، شعبۂ تعلیم وتربیت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

ڈاکٹر سید امان عبید
(اسوسی ایٹ پروفیسر، ڈائریکٹریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)
گچی باؤلی حیدرآباد 032 5000 (تلنگانہ)
موبائل : 6266434194

مضامین

# فلاحی اسکیمیں اور معذورین کے سماجی و معاشی مسائل : حیدرآباد کا ایک جائزہ

**خلاصہ:**

معذوری ایک تکلیف دہ اور پیچیدہ کیفیت کا نام ہے جو کسی شخص کے جسمانی نقائص اور سماجی رویوں کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ حکومت کی جانب سے بہبودی پالیسی کے طور پر معذور افراد کی فلاح کے لیے مختلف اسکیمات بنائے اور نافذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن معذور افراد کو بااختیار بنانے کا یہ واحد راستہ نہیں ہے۔ معذور افراد کو بااختیار بنانے کا یہ عمل دوطرفہ ہونا چاہیے۔ جس میں پالیسیوں سے آگاہی، ان تک رسائی اور پالیسیوں سے استفادہ کے ساتھ ساتھ پالیسی سازی میں معذورین کی حصہ داری بھی شامل ہو۔ معذوری میں بحیثیت مجموعی نقائص، سرگرمی کی محدودیت اور کاموں میں شامل ہونے میں رکاوٹ جیسی کیفیات کا احاطہ ہوتا ہے لیکن سماجی و معاشی مسائل کے حوالے سے معذورین کو غریبی امتیازی سلوک، لاچاری، پچھڑے پن اور علاحدگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ حیدرآباد کے اس مطالعہ میں مقداری تحقیق اور کثیر مرحلہ واری نمونہ سازی کے ذریعہ 394 افراد سے معلومات جمع کی گئیں اور اس کے لیے انٹرویو شیڈیول کا استعمال کیا گیا۔ اس مقالہ کے ذریعہ حیدرآباد میں معذورین کی فلاح و بہبود کے تئیں سرکاری اقدامات اور فلاحی اسکیموں سے متعلق معذوروں کی آگاہی، ان تک رسائی اور ان سے استفادہ کی سطحوں کا مطالعہ کیا گیا اور اس بات کو بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ فلاحی اسکیمیں ان کی سماجی اخراجیت کو کس قدر دور کر کے شمولیت کو فروغ دے رہی ہے۔

اہم الفاظ : فلاحی اسکیمات، معذورین، سماجی۔ معاشی مسائل، حیدرآباد

**تمہید:** موجودہ دور میں معذوری کوئی ڈھکا چھپا تصور نہیں ہے؛ تقریباً تمام ہی افراد اس اصطلاح سے اور کچھ حد تک اس کی وجوہات اور اس کے نتائج سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ترقی و معذوری کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو پاٹنے کے لیے بہت کچھ کیا بھی جارہا ہے۔ متعدد قوانین اور دفعات، رپورٹس، دستاویزی کام اور تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ترقی پذیر سماجوں میں معذور دوست ماحول کے لیے معذوری سے عدم امتیاز کے رویے کی ضرورت ہے۔ قانون آر پی ڈی کی دفعہ 4 حکومتوں کو پابند کرتی ہے کہ وہ کنونشن میں تسلیم کردہ حقوق کی عمل آوری کے لئے قانون سازی کے اقدامات کریں۔ اس ضمن میں ایک نمایاں پیش رفت دسمبر 2016 میں قانون حقوق معذورین (آر پی ڈی) کا مسودہ ہے (Math et al., 2019) زمینی سطح پر معذوری کے حامل افراد اوان کے لیے بنائی گئی اسکیموں سے معذوروں کی آگہی، رسائی اور سہولیات فراہم کرنے والے افراد کو مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ انہیں قوم کے لیے اثاثہ بنایا جاسکے۔

''معذورین میں وہ افراد شامل ہیں جو طویل عرصہ سے جسمانی دماغی اور قہم یا حساسیت کے لحاظ سے نقائص سے دوچار ہوں اور جو سماج میں دوسروں کی طرح بھرپور اور مؤثر شراکت داری نہیں کرسکتے اور اس شرکت کی راہ میں انہیں مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' (واین سی آر پی ڈبلیو ڈی 2007)۔ نقص جسم کی کارکردگی یا ساخت کا ایک مسئلہ ہے؛ جس کے سبب سرگرمی محدود ہوجاتی ہے اور کسی فرد کے لیے زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے میں مشکلات پیش آتی ہیں جس کے تجربات معذورین کو درپیش ہیں (World Health Organization. & World Bank 2011) معذوری پر عالمی رپورٹ (2011) کے مطابق دنیا میں ایک بلین سے زائد افراد (دنیا کی کل آبادی کا تقریباً 15 فیصد) کسی نہ کسی نوعیت کی معذوری کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، جن میں سے تقریباً 200 ملین افراد عام سرگرمیوں کی انجام دہی میں قابل لحاظ دشواریوں کا سامنا کرتے ہیں۔ ہندوستان نے حقوق معذورین کے اقوام متحدہ کنونشن کو سال 2007 میں تسلیم کیا تھا۔ ہندوستان میں جملہ آبادی کا تقریباً 2.21 فیصد جو کہ 26.81 ملین افراد پر مشتمل ہے، ایک یا زائد نوعیت کی معذوری سے دوچار ہے (مردم شماری 2011) (Quadri & Raza 2021) ہندوستان میں 121 کروڑ کی آبادی میں تقریباً 2.68 کروڑ افراد معذور ہیں جو جملہ آبادی کا 2.21 فیصد ہیں اور ریاست تلنگانہ میں 3.52 کروڑ کی آبادی کے مشمولہ 12.2 فیصد افراد معذور ہیں (مردم شماری، 2011)۔ ریاست تلنگانہ میں معذورین کی جملہ آبادی 10,46,822 ہے اور حیدرآباد میں معذورین کی جملہ تعداد 1,77,909 پائی گی (محکمہ بہبودی معذورین و معمر شہریان پر مختصر نوٹس 2017)۔

ہندوستان دنیا میں دوسری بڑی آبادی والا ملک ہے۔ یہاں بڑی تعداد میں معذور بچے ایسے خاندانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں جن کی آمدنی سطح غربت

مضامین

سے بھی بہت نیچے ہے۔ مونڈل اینڈ میٹے 2012 کے مطابق'' جہاں معذوری غربت کا سبب بنتی ہے، وہیں ہندوستان جیسے ملک میں غربت بھی معذوری کا باعث ہوسکتی ہے''۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو معذور افراد کے لئے باقاعدہ اسکولی تعلیم کے بشمول سماج میں معمول کے کاموں اور سرگرمیوں میں حصہ لینے میں رکاوٹ بنتی ہے (UN-2006)۔ غیر معذور افراد کے رویے معذور افراد کے سماجی ارتباط میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ آلور 2001 کا استدلال ہے کہ کسی معذور بچے کو'' اعمال کے نتیجے'' کے طور پر دیکھنا بچہ اور معذوری کو اس کے نجی سانحہ کے طور پر دیکھنے کے مترادف ہے اور اس طرح یہ فرد واحد کی انفرادی ذمہ داری ہوجاتی ہے۔ معذوری کو عرصہ دراز سے ایک انفرادی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا ہے جس کا نتیجہ سماج اور حکومت کی سرد مہری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ (موہیت 2000)۔ معذوری کے تئیں ردعمل میں 1970 کی دہائی سے تبدیلی آئی، جس کا بڑا سبب معذور افراد کی اپنی تنظیم اور معذوری کو انسانی حقوق کے ایک مسئلہ کے طور پر دیکھنے کے بڑھتے ہوئے رجحان تھے۔ تاریخی طور پر معذور افراد کا حل انہیں علاحدہ رکھنے مثلاً ان کے لیے علاحدہ اقامتی اداروں اور خصوصی اسکولوں کے ذریعہ فراہم کیا گیا۔ لیکن بعد میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور اس میں سماجی اور تعلیمی امور کو بھی شامل کیا گیا اور طلبی مرکوز حل نے اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے زیادہ تبادلہ خیال کے مواقع فراہم کیے کہ کئی لوگ ماحولیاتی عناصر ساتھ ہی ساتھ ان کے جسم سے بھی معذور ہوتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی اقدامات، جیسے اقوام متحدہ کے معذورین کے مواقع کی یکسانیت پر معیاری قواعد کو معذورین کے انسانی حقوق میں شامل کیا گیا، جو 2006 میں اقوام متحدہ کے کنونشن برائے حقوق معذورین (سی آر پی ڈی) کو اختیار کرنے کے ساتھ تکمیل کو پہنچا، عالمی رپورٹ برائے معذورین سے سی آر پی ڈی پر عمل آوری کا ثبوت ملتا ہے (Alwis et al.,2008) - یہ رپورٹ دنیا بھر میں معذورین کے حالات کو پیش کرتی ہے اور صحت سے بازآبادکاری تک اور تعلیم سے روزگار تک ان کی سماجی شمولیت میں اضافہ کرنے کے اقدامات کو اجاگر کرتی ہے۔ معذوری کے بارے میں عام خیال اس کے اہم تصورات جیسے معذوری کے تئیں انسانی حقوق کا رویہ، معذوری اور ترقی کے درمیان باہم ربط اور کارکردگی، معذوری اور صحت کی عالمی زمرہ بندی (آئی سی ایف) کو پیش کرتا ہے اور ان رکاوٹوں کو نمایاں کرتا ہے جن سے معذور افراد کو ان کی معذوریوں کی وجہ سے سامنا کرنا پڑتا ہے (WHO 2011)۔

**تحریری مواد کا جائزہ:** زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں تعلیم کا اہم کردار ہے اور روزگار زندگی کی پائیداری کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ معذورین کے لیے ان ضروریات کو پورا کر پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے اہم ترین ابتدائی برس بنیادی موقف کو سیکھنے کے لیے اہم وقت ہوتا ہے۔ (آلور 7: 2003)۔ تعلیم بنیادی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں مدد دیتی ہے جو کہ اعتماد اور عزت نفس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ ان صلاحیتوں کے فقدان کی وجہ سے معذور بچے مستقلاً دوسروں پر منحصر رہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، جب کہ تعلیم کے بغیر معذور بچے معذوری کی بنیاد پر امتیازی سلوک کے مکروہ چکر میں الجھ جاتے ہیں، ناخواندگی اور امتیازی سلوک کے خلاف اظہار خیال کی صلاحیت کی کمی وغیرہ مزید امتیازی سلوک کا سبب بنتی ہے (انسا کلاسنگ 2007:108) صحت کی خدمات نہ صرف معذوری کی سطح یا شدت کا مقابلہ کرنے بلکہ اس کے وجود کے خاتمہ کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔ (انسا کلاسنگ، 2007، صفحہ 77)۔ درحقیقت امتیازی سلوک اور تعصب ہی سے معذور ہونے کا احساس جنم لیتا ہے۔ (کولیرج 1993)۔

بدقسمتی سے جسمانی معذور لوگوں کے ساتھ پرانے زمانہ سے چلے آرہے تعصّبات اور غلط فہمیاں ابھی تک جاری ہیں اور ان معذور لوگوں کی سماجی و اقتصادی بحالی میں مخالف سماجی رویہ ہی سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ بے شعوری، غریبی، معذوری اور تعلیم کی عدم اہمیت انہیں سماجی و معاشی طور پر پسماندہ بنارہی ہے جو ان کے سماجی و معاشی اخراجیت کا سبب بن رہا ہے۔ سماجی اخراجیت کے تجزیہ کار غریبی کی وجہ اخراجیت کو سمجھتے ہیں لیکن زیادہ تر غریبی کو سماجی اخراجیت ہی کی ایک قسم تسلیم کرتے ہیں (دی حسینن 1998) آج بھی معذور افراد سماجی ہم آہنگی کے مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ (Garimella 2011)

معذورین کی صورت حال دوسروں کے مقابلہ میں بہت ہی پچھڑی ہوئی ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے مسلسل کوششیں جاری ہیں اور مرکزی در یاستی حکومت کی جانب سے فلاحی اقدامات کیے جاتے رہتے ہیں۔ معذورین کے لیے صداقتنامہ معذوری وشناختی کارڈ مہیا کرایا جاتا ہے۔ تعلیمی پروگرام، تعلیمی بھتہ جات اور اسکالرشپس، معاشی امداد، روزگار اور رعایتیں / دیگر سہولیات میں تحفظات وغیرہ بھی دی جاتی ہیں' تاہم معذوری اب ایسا مسئلہ نہیں رہا جسے بہ آسانی نظرانداز کردیا جائے۔ یہ متنوع، حرکیاتی اور واضح طور پر نظر آنے والا گوشہ ہے۔ دنیا بھر کے معذور افراد کو یہ ثابت کرنے کے لیے طویل جدوجہد کرنی پڑی کہ اگر

مضامین

مناسب مدد فراہم کی جائے تو یہ طبقہ مساویانہ اہلیت کا حامل ہے۔ای ڈی ایف (2003) پالیسی دستاویز میں پیش کردہ ڈیٹا بتاتا ہے کہ معذوری معمولی ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ جڑے ہوئے بڑے معاشی چیلنجز، ان مسائل پر دوررس اثرات مرتب کرتی ہے۔فلپ اوکیف ودیگر۔(2009) (Stein 2003)

**مقاصد:** اس مقالہ کے ذریعہ حیدرآباد میں معذورین کی فلاح وبہبود کے تین سرکاری اقدامات اور فلاحی اسکیمات کی آگاہی رسائی اور استفادہ کے درجات کا معائنہ کیا گیا۔

یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ فلاحی اسکیمات کس قدر ان کی سماجی اخراجیت کو دور کر کے شمولیت کو فروغ دے رہی ہے۔

**تحقیقی طریقہ کار:** حیدرآباد پر مرکوز اس مطالعہ میں مقداری تحقیق کے لیے چار زونس (مشرق، مغرب، سینٹرل اور جنوب) کو سادے بلاترتیب نمونہ سازی کے ذریعہ منتخب کیا گیا۔ کثیر مرحلہ واری نمونہ سازی کے ذریعہ 394 افراد کے نمونے سے معلومات جمع کرنے کی خاطر انٹرویو شڈیول کا استعمال کیا گیا۔ کو پوسوامی کے سماجی ومعاشی موقف کا پیمانہ استعمال کیا گیا۔ معذورین کی سماجی معاشی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے، فلاحی اسکیموں سے ان کے اطمینان اور ان کے استعمال سے زندگی کے اطمینان کو جانچنے کے آلات تیار کیے گیے جن کا اعتبار 0.944 پایا گیا۔

## نتائج:

**جواب دہندگان کا تعلیمی موقف:** تحقیق اور سروے کے بعد معذور جواب دہندگان کے تعلیمی موقف کے متعلق جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس کے مطابق گریجویٹ پوسٹ گریجویٹ جواب دہندگان کی زیادہ سے زیادہ تعداد 45.9 فیصد ہے اور پیشہ ور/اعزازی ڈگری کے حاملین 13.5 فیصد ہیں۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ پوسٹ ہائی اسکول ڈپلوما کے حامل معذوروں کی تعداد 12.7 فیصد ہے۔ ہائی اسکول والوں کی تعداد 10.9 فیصد رہی جب کہ مڈل اسکول والے 1.8 فیصد، پرائمری اسکول والے 3 فیصد اور ہمیشہ کے لیے ناخواندہ رہنے والے 12.2 فیصد ہیں۔

**جواب دہندگان کے پیشہ کا موقف:** جواب دہندگان کو ان کے پیشوں کے مطابق تقسیم کیا گیا ہے۔ ان معلومات میں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ 17.8 فیصد معذورین عارضی پیشوں میں برسرکار ہیں اور صرف 4.6 فیصد تعداد ہی مستقل پیشوں سے وابستہ ہے جبکہ دفتری / دکان مالک / کسان جیسے پیشوں والے معذورین 5.6 فیصد ہیں اور ہنرمند افراد کی تعداد 3.3 فیصد ہے۔ اسی طرح معمولی ہنرمند معذورین کا تناسب 3.6 فیصد ہے جبکہ غیر ہنرمند افراد 6.3 ہیں اور بے روزگار افراد کی تعداد 61.7 فیصد ہے لیکن ان میں ایسے جواب دہندگان بھی شامل ہیں جو ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

**جواب دہندگان کے خاندان کی آمدنی کا موقف:** جواب دہندگان کے خاندان کی آمدنی کی صورت حال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان معلومات میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ 27.9 فیصد جواب دہندگان کے خاندانوں کی آمدنی بہت ہی کم ہے جب کہ جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 37.8 فیصد کا تعلق درمیانی آمدنی والے گروپ سے ہے اور زیادہ آمدنی والے گروپ میں صرف 34.8 فیصد ہی نظر آئے۔

جواب دہندگان کے خاندان کی آمدنی کا اوسط تناسب 2.8-5.035 رہا۔ زیادہ تر جواب دہندگان کے خاندان کی آمدنی کو پوسوامی کے سماجی معاشی موقف کے پیمانہ کے اعلیٰ اور زیریں سطح کے مطابق ہے اور اس پیمانہ کو سال 2016 میں منیش آر کھیر نار نے مزید بہتر بنایا تھا۔

**جواب دہندگان کا سماجی۔معاشی موقف:** اس سروے کے ذریعے جواب دہندگان کا جو سماجی اور معاشی موقف سامنے آتا ہے اس کے مطابق زیادہ تر جواب دہندگان اوسط سماجی۔ معاشی موقف کے حامل ہیں جن کا تناسب 37.8 فیصد ہے ۔ جواب دہندگان کے لیے انتہائی کم پیمانہ 1.885 رہا (ایس ڈی 0.781240 اور فرق 0.610)۔ یہ جواب دہندگان کے سماجی ومعاشی موقف کے پیمانہ کے دائرے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سماجی۔ معاشی موقف کے معاملے میں جواب دہندگان عام طور پر نچلی سطح پر موجود درمیانی زمرہ میں اور خاص طور پر اونچی سطح پر موجود نچلے زمرہ میں آتے ہیں اور یہ کو پوسوامی کے سماجی ومعاشی پیمانے کے درجہ کا چوتھا زمرہ ہے۔ مالیاتی کارپوریشن اور دیگر مالیاتی ادارہ جات کے ذریعہ خود روزگار کی خاطر جو معاشی امداد فراہم کی جاتی ہے وہ معذورین کے لیے ناقابل رسائی ہے۔

معذور جواب دہندگان کے سماجی معاشی موقف کی سطحوں کو اقدار کے پہلے اور تیسرے نقطہ تقسیم کی اساس پر نچلے، درمیانہ اور اعلیٰ، تین گروپس میں تقسیم کیا

مضامین

گیا ہے۔ان میں سے اکثریت اوسط درجے پر پائی گئی جن کا تناسب 37.8 فیصد ہے۔

**جواب دہندگان کی تعلیمی حالت اور سماجی معاشی حیثیت:** اس مطالعہ میں مزید اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ جواب دہندگان کی تعلیم اور ان کے سماجی معاشی موقف کے مابین دوہرے تعلق کو تلاش کیا جائے۔جیسا کہ کہا گیا کہ اس مطالعہ کا نمونہ 394 جواب دہندگان پر مشتمل ہے جن میں گریجویٹس کی اکثریت یعنی 60.2 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل ہے۔

مزید یہ بات بھی سامنے آئی کہ جواب دہندگان کے تعلیمی موقف (غیر منحصر متغیر Independent variable) اور سماجی معاشی موقف منحصر متغیر (Dependent variable) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر بھی ٹھوس یعنی (X2=267.826 df=12 p=.000 c=0.636) لہٰذا اس مطالعہ میں جواب دہندگان کے تعلیمی موقف کا تعلق سماجی معاشی موقف اعداد و شمار کے مطابق واضح نظر آتا ہے۔

**جواب دہندگان کا پیشہ ورانہ موقف اور سماجی معاشی حیثیت:** اس مطالعہ میں مزید کوشش کی گئی کہ جواب دہندگان کے پیشہ اور ان کے سماجی معاشی موقف کے مابین دوہرے تعلق کو بھی تلاش کیا جائے۔جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 48.6 فیصد تعداد بے روزگار اور اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل ہے۔

مزید یہ بات بھی سامنے آئی کہ جواب دہندگان کے پیشہ ورانہ موقف (غیر منحصر متغیر Independent variable) اور سماجی معاشی موقف (منحصر متغیر Dependent variable) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر بھی ٹھوس یعنی (X2=336.087df=12 p=.000 0.678)۔لہٰذا اس مطالعہ میں جواب دہندگان کے پیشہ ورانہ موقف کا تعلق سماجی معاشی موقف اعداد و شمار کے مطابق واضح نظر آتا ہے۔

اس مطالعہ کی دیگر معلومات معذور جواب دہندگان کے تعلیمی موقف کی منظر کشی کرتی ہیں جس کے مطابق جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 45.9 فیصد تعداد گریجویٹس / پوسٹ گریجویٹس ہے اور دیگر مثلاً پیشہ ورانہ / اعزازی ڈگری کے حاملین کا فیصد 13.5 ہے۔انٹرمیڈیٹ ہائی اسکول کے بعد ڈپلوما کرنے والے 12.7 فیصد ہیں، اسی طرح ہائی اسکول والوں کا فیصد 10.9 ہے۔مڈل اسکول والوں کا فیصد 1.8 ہے اور پرائمری اسکول والے 3 فیصد ہیں۔اسی طرح ناخواندہ افراد کی تعداد 12.2 فیصد ہے۔

یہ معلومات جواب دہندگان کی ان کے پیشہ ورانہ موقف کے لحاظ سے تقسیم کو بھی ظاہر کرتی ہیں جس کے مطابق 17.8 فیصد افراد ہنر مند مزدور اور دکان و بازار کے سیلز ورکرس ہیں۔صرف 4.6 فیصد ہی قانون ساز اور سینئر افسر و منیجرس وغیرہ ہیں، اسی طرح ہنر مند کسانوں اور مچھلی پالن مزدوروں کی تعداد 5.6 فیصد ہے اور کاریگروں اور دیگر متعلقہ پیشوں کے ورکروں کا تناسب 3.3 فیصد ہے کارخانوں اور مشینوں کے آپریٹرس 3.6 فیصد پائے گئے اور چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کی تعداد بھی 3.6 فیصد ہی دکھائی دی جبکہ بے روزگاروں کی تعداد 61.7 فیصد ہے جن میں ایسے جواب دہندگان بھی شامل حال ہیں جو ہنوز تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔یہ معلومات اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہیں کہ 27.9 فیصد جواب دہندگان کم آمدنی والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔زیادہ تر جواب دہندگان کی تعداد اوسط آمدنی والے خاندانوں سے ہے جن کا فیصد 37.8 ہے اور زیادہ آمدنی والے گروپس میں موجود جواب دہندگان 34.8 فیصد ہیں۔یہ معلومات ایسی اطلاع بھی فراہم کرتی ہیں کہ کمزور سماجی معاشی موقف کے دائرے میں جواب دہندگان کی زیادہ سے زیادہ تعداد 96.7 فیصد ہے اور اوسط سماجی معاشی موقف کے حاملین کی تعداد 3.3 فیصد ہے۔جواب دہندگان کی اوسط کارکردگی 1.885 (ایس ڈی 0.781 اور تغیر 0.610) رہی۔جواب دہندگان کے سماجی معاشی موقف کے دائرے 2 سے 3 کے درمیان پائے گئے۔جس کا یہ مطلب ہوا کہ سماجی معاشی موقف کے معاملے میں جواب دہندگان بالعموم اوسط زمرہ میں ہیں اور یہ زمرہ کو پوسوامی کے سماجی معاشی درجہ بندی کا زمرہ ہے۔

اس مطالعہ کے جملہ جواب دہندگان میں اوسط عمر کے جواب دہندگان کی اکثریت یعنی (41.6 فیصد) تعداد سماجی و معاشی موقف کی درمیانی حالت پر مشتمل ہے۔عمر (غیر منحصر فرق Independent variable) اور سماجی معاشی موقف (منحصر کرنیوالا Dependent variable) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کمزور ہے یعنی (c 0.323 = df=4 p=000 45.801-X2)۔مرد جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 38.7 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی موقف کی حامل ہے۔صنف (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح نہیں ہے (X2=5.966

(0.122 c .051 df=2p=)۔ ہندو جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 47.7 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی موقف کی حامل ہے۔ مذہب (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کمزور ہے یعنی (x2=59.845 df=2p=,000 c= 0.355) ۔ غیر شادی شدہ جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 43.7 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حالت کی حامل ہے۔ شادی شدہ موقف (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر بھی ٹھوس ہے یعنی (X2=32.894df8p=.000 c=0.278)۔ ہاتھ پیر سے اپاہج جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 43.8 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حالت کی حامل ہے۔ معذوری کی اقسام (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کمزور ہے (X2=41.335df 6 p=.000 c= 0.308) ۔ ہاسٹلس میں رہنے والوں کی اکثریت یعنی 56.4 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل ہے۔ رہائشی حیثیت (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر کمزور ہے یعنی ($X^2$= 35.250 df 2 p=.000 c= 0.287) ۔

اس مطالعے کے جواب دہندگان کی اکثریت یعنی 43.2 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل اور فلاحی اسکیموں کی آگاہی اعلی (42.3 فیصد) سطح پر ہے۔ فلاحی اسکیمات سے متعلق آگاہی (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر کمزور ہے (X2=56.594 df=4p=.000 c=0.354)۔ جواب دہندگان کی فلاحی اسکیمات تک رسائی کم سطح (56.5 فیصد) پر ہے (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر متغیر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر کمزور ہے (X265.579 df=4 p=.000 c=0.378) ہے۔ 44.4 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل اور فلاحی اسکیموں سے استفادہ اوسط سطح پر ہے۔ جواب دہندگان کی فلاحی اسکیمات سے استفادے (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر کمزور ہے (X2=78.808df=4 p=.000 c=0.408) ہے۔ اکثریت یعنی 47.1 فیصد تعداد اوسط سماجی و معاشی حیثیت کی حامل اور فلاحی اسکیموں سے اطمینان کی اوسط سطح پر ہے۔ فلاحی اسکیمات سے اطمینان (غیر منحصر) اور سماجی معاشی موقف (منحصر) کے مابین دوہرا تعلق واضح ہے اور اس تعلق کی پیمائش کی قدر کمزور ہے (X2=78.422 df=4 p=.000 c=0.407) ہے۔

**بنیادی مباحث وسفارشات:** معذور افراد اس بات سے بھی واقف نہیں ہیں کہ 18 برس کے بعد انہیں 4 سال کی مدت تک کے لیے اپنے سکنڈری اسکول کی تکمیل کرنے میں مدد کی جائے گی۔ مشاہدہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ نابینا لڑکیوں کو تعلیمی سہولتوں کے بارے میں مناسب معلومات نہیں ہیں اور ان کی ان سہولتوں تک رسائی بھی نہیں ہو پاتی۔ اور جب کبھی ایسی ضرورت محسوس ہو تو دستیاب مواد کا ترجمہ کرنے اور اسے علاقائی زبان میں پیش کرنے کا کام بھی صحیح طریقے سے نہیں ہوتا۔ جسمانی معذور افراد اپنی تعلیم' غذا' مکان وغیرہ جیسی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر خوش تھے لیکن دوسری جانب وہ اس بات پر غم زدہ بھی تھے کہ روزگار، سہولیات تک ناقص رسائی، شادی کی دشواریاں جیسی رکاوٹوں کے سبب ان کا کوئی مستحکم مستقبل نہیں ہے۔ چنانچہ فلاحی اسکیموں کے اطمینان کی سطح ان کے ہاں اوسط ہے اور مرکزی حکومت کی جانب سے شروع کی جانے والی صحت کی اسکیم" سوادا لمسحن ہیات اسکیم اور کسٹرس رعایت اسکیم" کے متعلق بھی انہیں کوئی آگاہی نہیں ہے۔ تجزیے کے ذریعے اخذ کیے گئے نتائج سے معذورین کی سماجی۔ معاشی حیثیت' اوسط درجہ پر تھی اور ان کی سماجی۔ معاشی حیثیت اور فلاحی اسکیموں کے درمیان تعلق بھی پایا گیا لیکن یہ تعلق کمزور تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے اس' تعلق کی قدر 0.5 سے کم ہے، اسی وجہ سے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ مرکزی و ریاستی پالیسیوں اور فلاحی اسکیموں کو مستحکم بنایا جائے اور معذور پیدا ہونے والے ہر بچے اور معذوری کا شکار ہونے والے ہر فرد کو معذور افراد کے محکمے سے جوڑا جائے تا کہ وہ جن فوائد کے مستحق ہیں وہ انہیں حاصل ہوسکیں۔

**خلاصہ:** اس مطالعہ سے یہ نتیجہ سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معذور افراد کو مرکزی دھارے میں لانے کے لیے سماجی۔ معاشی بہبودی کی مختلف فلاحی اسکیموں کو مزید مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ اور سماج کے ان محروم طبقات کو بااختیار بنانے اور ان کو اوپر اٹھانے کے لیے مرکز اور ریاست کی جانب سے مزید کوششوں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ معذور افراد اور ان کے خاندان / دیکھ بھال کرنے والوں کی سماجی و اقتصادی حیثیت کو مضبوط کرنا بھی ایک اہم کام ہے جس پر توجہ دینا

چاہیے۔انہیں ملک کی ترقی کے عمل میں انفرادی قوت بننے کے لیے فلاحی اسکیموں اور رہائشی سہولیات سے استفادہ کرنے کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے۔ضرورت ہے کہ موثر رسائی کے اقدامات اور مواقع کی مساوات میں جامع شرکت کو بڑھایا جائے ،معذورین کی صورت حال کو بہتر بنا کر انہیں بااختیار بنایا جائے۔ جہد کاروں کا مزید کہنا ہے کہ ''ہمارے بغیر ہمارے بارے میں کچھ نہیں'' کیونکہ ان کا خیال ہے کہ معذور افراد کو درپیش مسائل صرف اسی صورت میں موثر طور پر حل ہو سکتے ہیں جب انہیں لاحق رکاوٹوں / خطرات کو دور کرنے کے لیے فیصلہ سازی کے عمل میں راست طور پر انہیں شامل کیا جائے۔( بحوالہ معذوری پر عالمی رپورٹ،2011)

***

**REFERENCES**

1. Alur, M. (2003). Invisible Children: A study of Policy Exclusion. Viva Books, Bombay.
2. Alur, M. (2007). Education of children and young adults. Presentation made at the People with disabilities in India: status, challenges and prospects workshop held at World Bank, New Delhi, India.
3. Alwis, R. de S. de, UNFPA, & UNCRPD. (2008). Disability Rights , Gender , and Development A Resource Tool for Action.
4. Coleridge, P. (1993). Disability, Liberation and Development. Oxfam, Oxford.
5. Garimella, S. (2011). Policies and Schemes of Central and State Governments for People with Disabilities. In Sightsavers India. https://www.sightsaversindia.in/wpcontent/uploads/2014/06/17581_Policies-and-Schemes-of-Central-and-StateGovernments-for-People-with-Disabilities.pdf
6. Klasing, I. (2007). Disability and Social Exclusion in Rural India. Rawat Publications, Jaipur.
7. Math, S., Gowda, G., Basavaraju, V., Manjunatha, N., Kumar, C., Philip, S., & Gowda, M. (2019). The rights of persons with disability act, 2016: Challenges and opportunities. Indian Journal of Psychiatry, 61(10), S809–S815. https://doi.org/10.4103/PSYCHIATRY.INDIANJPSYCHIATRY_105_19
8. Mohit, A. (2000). Disability in India: Family responsibility or Social Issue? Sign of a Gradual Paradigm Shift. Disability World News, August-September Edition, available at http://www.disabilityworld.org/Aug-Sept2000/International/india.html
9. Quadri, S. S., & Raza, M. S. &. (2021). Persons with Disabilities and Welfare Schemes Satisfaction: A study of Hyderabad. NIU International Journal of Human Rights, 8, 2021.
10. Stein, M. A. (2003). THE LAW AND ECONOMICS OF DISABILITY ACCOMMODATIONS. https://about.jstor.org/terms
11. UN. (2006). United Nations Convention on the Rights of Persons with Disabilities. http://www.un.org/esa/socdev/enable/rights/convtexte.htm
12. WHO. (2011). World Report on Disability. https://www.who.int/disabilities/world_report/2011/report.pdf
13. World Health Organization., & World Bank. (2011). World report on disability. World Health Organization.

ڈاکٹر سیدہ صبا قادری' پی ایچ۔ڈی' سوشیل ورک' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' گچی باؤلی' حیدرآباد۔032 500 ( تلنگانہ )' موبائل :48305530

# فن خوش نویسی اور کچھ ہندو خطاط

جو تحریر صاف اور خوشخط ہوتی ہے وہ حسن کے دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح نہایت خوشنما لگتی ہے، اس کے حسن میں انسان کھوجاتا ہے، اور دل میں اس کی اور لکھنے والے کی قدر ومنزلت بڑھ جاتی ہے، جب کہ ناصاف اور بد خط تحریریں دیکھ کر دل میں انقباضی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اسے پڑھنے کو دل نہیں چاہا کرتا، اس لیے پہلے زمانے میں مکاتب و مدارس اور اسکول میں خوش خطی کی مشق کرائی جاتی تھی ، بالخصوص اردو اور فارسی میں خوش نویسی میں کمال پیدا کرنے کے لیے الگ سے ایک استاد مقرر رہتے تھے اور ان سے اصلاح و مشق سیکھی جاتی تھی، ان کی وصلیوں کو سامنے رکھ کر اس کی کاپی اتارنے کی کوشش کی جاتی ، پھر اسے معلم کے پاس دکھا کر حروف کی نشست و برخاست کا طریقہ اور نوک پلک درست کرنے کا پیمانہ سیکھا اور سکھایا جاتا تھا۔ یہ ایک مستقل فن ہے، اور نہایت پاکیزہ اور متبرک فن ہے، انیس چشتی لکھتے ہیں ”عدم توجہی، لاابالی پن، اور اول جلول انداز اس فن کو مجروح کرتا ہے، ایک حسین وجمیل نمونۂ خط ایک پاکیزہ ذہن کی پیداوار ہے ذہن کے علاوہ جسم میں بھی غضب کا سمٹاؤ اور ہاتھوں اور انگلیوں میں زبردست لچک بہترین حروف ڈھال سکتی ہے۔(اردو خوش نویسی۔۱۹، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان)

ایک زمانہ تھا؛ جب انسان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا، اللہ نے اسے قلم کے ذریعے لکھنا پڑھنا سکھایا، اور مختلف نقوش کے ذریعے لکھنے پڑھنے کے کام کا آغاز ہوا، زمانہ بدلتا گیا، اور تدریجی طور پر آبادیوں کے پھیلنے کے ساتھ زبانیں وجود میں آتی گئیں، اور لکھنے کے انداز وطریقے بدلتے گئے، ترقیاں ہوتی گئیں، جس کی وجہ سے ہر زبان میں اچھے اچھے لکھنے والے یعنی خطاط وجود میں آتے گئے۔

خطاطی اور کتابت ہمارا اہم ورثہ ہے، جس نے ماضی میں ہندوستانی ثقافت کو بہترین آرٹسٹ اور فن کار دیے ہیں، لیکن آج کا دور سائنسی دور ہے، سائنسی ترقیات نے جہاں ہمیں بہت سی قیمتی سوغاتیں بخشیں، وہیں کتنی دست کاریوں، صنعتوں اور فنون کو نگل لیا، موجودہ دور کے ٹیکنالوجیکل نظام میں اس فن کی اہمیت کم ہوگئی، اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے، کتنے ہی بڑے بڑے خطاط اس وقت مکھی مارتے مارتے مر چکے ہیں اور کتنے بے روزگاری کی وجہ سے اپنا کام اور حلیہ بدل چکے ہیں، کیونکہ ان کے روزگار کے ذرائع مسدود ہوکر رہ گئے ہیں، خطاطوں اور کاتبوں کے لیے روزگار کے مواقع میں بے حد کمی آئی ہے، اس لیے اس فن کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے ۲۰۰۱ء سے کیلی گرافی یعنی کتابت کے فن کو جدید گرافک ڈیزائنگ کے ساتھ شامل کر کے تربیتی کورس شروع کیا، تاکہ نہ صرف اس قدیم فن کی حفاظت کی

مضامین

جاسکے، بلکہ کاتبوں اور خطاطوں کو روزگار کے باوقار مواقع بھی ملیں۔ (اردو خوش نویسی۔ کیلی گرافی اور خطاطی) اللہ کے فضل سے راقم الحروف بھی اس کورس سے جڑ کر اس کی خوبیوں سے واقف ہوسکا۔

مذہب اسلام کا جس وقت سورج طلوع ہوا اس وقت عرب میں ''خط نبطی'' رائج تھا، جو بعد میں خط کوفی کہلایا، عہد رسالت میں اسی خط کا استعمال ہوتا تھا، اور کلام مجید بھی اسی زبان میں لکھا جاتا تھا، اس وقت حروف، اعراب اور نقطوں سے معری تھے، حضرت علی کے حکم سے ان کے ایک شاگرد ابوالاسود دوئلی نے ہم شکل اور مختلف المخارج والاصوات حروف کے تلفظ میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لیے نقطے ایجاد کیے، (از: تمدنی کارنامے) جب کہ کچھ لوگ یہ خدمت حجاج ابن یوسف کی طرف منسوب کرتے ہیں، رفتہ رفتہ خط کوفی کی ظاہری شکل میں تبدیلی ہوتی رہی، اور تیسری صدی کے اخیر تک تغیرات کے ساتھ اس کے حسن میں بھی نمایاں اضافہ ہوا، اور اس کے بڑے بڑے خوش نولیس پیدا ہوئے۔ جن میں سے بعض نے اس میں مختلف طرز ایجاد کر کے بڑا تفنن پیدا کیا لیکن وہ سب شکلیں خط کوفی سے موسوم رہیں، تا آنکہ مقتدر باللہ عباس ۲۹۵ھ کے زمانے میں ابوعلی محمد بن علی المعروف بہ ''ابن مقلہ'' پیدا ہوا، جو بڑا فاضل، منشی اور ادیب تھا جو مقتدر کے زمانے میں وزارت کے درجے تک پہنچ گیا، یہ اعلی درجہ کا خطاط تھا، اس نے خط کوفی کو ترقی دے کر ایک نئے خط کی بنیاد ڈالی، جو اپنے حسن و نفاست میں ضرب المثل تھی، اس کا نام اس نے ''بدیع اور محقق'' رکھا، پھر اس سے نیا خط ''ثلث و ریحان'' ایجاد کیا، یہ خط آج بھی رائج ہے، خط ثلث میں اعلی خطاط اپنے فن کے جوہر دکھاتے ہیں، مگر یہ بڑا مشکل خط ہے اور تمام خطاط اس کے کمال درجہ تک نہیں پہنچ پاتے، اس کے اندر بڑی نفاست اور صفائی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، آجکل یہ خط کتابوں کے ٹائیٹل اور طغرے وغیرہ کے لیے بہت مقبول ہے، اگر چہ کمپیوٹر کے فونٹ میں اس کی بھی شمولیت ہے، اور اچھا انداز اختیار کیا گیا ہے، لیکن اب بھی اس خط کے جو ماہر ہیں، وہ اپنے ہاتھ کے جوہر سے ثلث کو اتنی بلندی تک پہنچا دیا کر اتنی خوبصورتی لے آتے ہیں کہ کمپیوٹر بس دیکھتا رہ جائے، کیونکہ اس کے اندر سے وہی چیز نکلتی ہے جو اس میں داخل کر دی گئی ہے، جب کہ ہاتھ کے ذریعے اس میں طرح طرح کے نقوش اور شکلیں بنائی جاسکتی ہیں۔

خط کوفی بہت آسان خط تھا، جو سیدھی لائن پر کچھ حروف ابھار کر تحریر کیے جاتے تھے، جسے اس وقت خط ٹائپ یا ''بمبئی بلیک'' کے مشابہ کہا جاسکتا ہے، خط بدیع اور محقق نے آگے چل کر خط نسخ کی شکل اختیار کر لی، اس کو خط نسخ اس لیے کہا گیا کہ وہ سابقہ خط کا ناسخ بن گیا، یہی خط کتابوں میں رائج ہوا، اور قرآن پاک بھی اسی میں لکھا گیا، البتہ ثلث وغیرہ کتبات اور سرخیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ابن بواب المتوفی ۴۲۳ھ؛ جو اپنے زمانہ کا نامور خطاط تھا، اس نے اپنے زمانے میں چھ خط ایجاد کیے، ثلث، نسخ، تعلیق، ریحان، محقق اور رقاع، یہی چھ خط سب سے زیادہ

مقبول ہوئے ۔ ساتویں صدی کے وسط تک خط نسخ کا زیادہ رواج رہا، اسی صدی میں خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد ہوا، جو نوک پلک کے اعتبار سے نسخ سے بھی زیادہ خوبصورت تھا، اس کا موجد خواجہ میر علی تبریزی تھا، یہ خط ابتدا میں نسخ و تعلیق کہا جاتا تھا، پھر کثرت استعمال سے ''نستعلیق'' بن گیا، اردو کی یہ تحریر؛ جو آپ پڑھ رہے ہیں، یہ خط نستعلیق میں کمپیوٹر کے ذریعے لکھی گئی ہے، اس وقت بہت سے خط ایجاد ہوئے ہیں، جو کمپیوٹر میں محفوظ ہیں، لیکن مشہور سات ہیں، جن کے ماہرین کو ''ہفت قلم'' کہا جاتا ہے۔ طغرا نویسی اس سے الگ تھی۔

ان ساتوں خطوط میں ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں نے اگرچہ اپنے اپنے جوہر دکھائے، اور اپنی مہارت کا ثبوت دیا، جن کے خوش خط لکھے ہوئے قطعات، رباعیات، آیات قرآنی کے طغرے وغیرہ سامان آرائش تھے، جن سے زیب و زینت کے ساتھ اخلاق کا سبق ملتا تھا، لیکن اس فن میں مسلمانوں کی مہارت کے ساتھ ہندوؤں نے بھی باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کر کے اپنے ذوق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں میں تعلیم کے فروغ کے بارے میں ''تمدنی کارنامے'' کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں فرماں روایانِ اسلام نے جو بڑے بڑے مدارس قائم کیے، وہ زیادہ تر مذہبی حیثیت رکھتے تھے، وہ مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے، البتہ مکاتب میں معمولی نوشت و خواند اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اس لیے ہندو بھی ان میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے، مسلمانوں سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق تعلیم ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقہ تک تھی، اور حکم تھا کہ اگر ''وید'' کا کوئی فقرہ ''شودر'' کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پلا دیا جائے'' اس کی وجہ سے ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں تعلیم کا مطلق رواج ہی نہیں تھا، لیکن مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر تعلیم کو ہندوؤں کے ہر طبقہ تک عام کر دیا، اور برہمنوں سے لے کر کھتری، کائستھ بنیے، اور ان سے بھی نیچے درجوں تک علم اتر آیا، اس لیے ہر دور میں ان میں صاحب علم و کمال پیدا ہوتے رہے، جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے، تیموریوں کے عہد میں ہندوؤں میں تعلیم کا رواج بہت ہوا، بیشتر ہندو شرفا فارسی زبان و ادب، خوش خطی و خطاطی اور دوسرے مروجہ فنون میں پورا درک رکھتے تھے، خصوصاً لاہور، دلی، آگرہ، اودھ اور بہار کے ہندو تعلیم میں بہت ممتاز تھے، ان کی فارسی زبان میں نثر و نظم میں بے شمار کتابیں ہیں، ہندو شعرا کی فارسی شاعری میں تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔

اُس زمانہ میں خوش خطی لازمۂ تعلیم و شرافت سمجھی جاتی تھی، اور ہندو بھی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سرکاری دفاتر خصوصاً مال اور دیوانی کے شعبے میں ان کی کثرت تھی، اور دفتری کاروبار کے لیے انشا اور خوش خطی ضروری تھی، اس لیے ہندوؤں میں بہت سے خوش نویس خصوصاً خط نستعلیق اور شکست کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے، جو اپنے دور میں

ماہر استاد تسلیم کیے جاتے تھے، محمد شاہی عہد کے ماہر استاد اور خوش نویس حفیظ خان تھے، ان کے شاگردوں میں جہاں مسلمان خطاط تھے، وہیں خط شکست میں منشی لچھمن سنگھ، لچھی رام پنڈت، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ وغیرہ اپنے دور کے نامور استاد تھے۔ انیس صدیقی نے خط نستعلیق کے ماہرین میں داراشکوہ، اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ منشی دیبی پرشاد کو بھی شمار کیا ہے۔ (اردو خوش نویسی۔ ص 34) اسی طرح انیس صدیقی نے خط نسخ کے ماہرین متقدمین و متاخرین کا جہاں ذکر کر کے کچھ ناموں کو مختصراً لکھا ہے ان میں رائے منوہر کے نام کو بھی اجاگر کیا ہے۔ حوالۂ مذکورہ۔ ص 121-

لکھنؤ کے خوش نویسوں میں حافظ نوراللہ دہلی سے نواب آصف الدولہ کے دور میں آئے، اور دربار آصفی سے منسلک ہوئے، اپنے دور کے بڑے باکمال خوش نویس تھے، ان میں ایسی سحر کاری تھی کہ اس کے دیکھنے سے دل سیر نہ ہوتا تھا، ان کے شاگردوں میں لالہ سرپ سنگھ مشہور خوش نویس تھے جیسا کہ ''تمدنی کارنامے'' میں مذکور ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز اور سب سے اول تو خود ان کے بیٹے ابراہیم تھے، دوسرے منشی سرپ سنگھ نام کے ایک ہندو بزرگ تھے۔

اس کے علاوہ ہندو خوش نویسوں میں راجہ ٹوڈرمل کھتری ہیں، جو اکبری دور کے مشہور امیر اور دربار اکبری سے وابستہ تھے، مولوی غلام محمد دہلوی ان کے ہاتھ کی صفائی اور روانی کے ساتھ ان کی اچھی کتابت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''نویسندۂ چابک دست، وخطوط بخوشخطی ونمکی می نوشت''۔ ان کے علاوہ دیگر خطاطوں میں رائے منوہر بن لوئی کرن توسنی کچھواہا ہیں جو راجہ سانبھر کے لڑکے تھے، اکبر کے دامن تربیت میں پرورش پائی، جہانگیر کے دور میں ان کی نشوونما ہوئی، مرزا راجہ خطاب تھا، اکبر ان کو بہت مانتا تھا، یہ فارسی زبان کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، اور خوش نویس بھی، مولوی غلام نے ان کی شاعری اور خوش نویسی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''سلیقۂ شاعری وخوش خطی بہم رسانیدہ''۔ چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کے مشہور شاعر اور ادیب اور اہل قلم تھے، مختلف امرا کی سرکاروں میں ملازم رہے، داراشکوہ کو ان کی انشا بہت پسند تھی، اس لیے زندگی بھر ان کے میر منشی رہے، یہ اعلی درجے کے خوش نویس تھے، نستعلیق میں آقا عبدالرشید دیلمی اور خط شکست میں مکاتب خان کے شاگرد تھے، دونوں میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ ایک منشی سنج بھان تھے، یہ بھی مذکورہ بالا دونوں اساتذہ کے شاگرد اور نستعلیق وشکست کے ماہر تھے۔ رائے پریم ناتھ کھتری کے اسلاف شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ''پیش کارتن'' کے عہدے پر سرفراز تھے، یہ اپنے زمانے کے مشہور خوش نویس تھے، خصوصا خط شکست بہت عمدہ لکھتے تھے۔ راجہ امیر سنگھ اور راجہ شیر سنگھ راجہ بہادر کے لڑکے تھے، دونوں بھائی رائے پریم ناتھ کے شاگرد اور خوش خطی میں استاد کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے۔ کنور پریم کشور رفاقتی راجہ جگل کشور کے پوتے اور مشہور خوش نویس تھے، بہت اچھا لکھتے تھے،

کلیات کلیم اور شاہجہاں نامہ کو خط شکست میں بہت عمدہ لکھا، ساتھ ہی اردو کے خوش گوار شاعر تھے۔

منشی لچھمن غیوری قوم کے اگروال، علم و ہنر کے زیور سے آراستہ تھے، عربی و فارسی زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے، فارسی کے اعلی درجہ کے انشا پرداز تھے، اپنی انشا پر ان کو اتنا ناز تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، شاعر بھی تھے، ان کی تصنیف ''شعلۂ آہ'' ہے، اس کے ساتھ خوش نویس تھے، خط شکست میں محمد حفیظ خان اور مرزا آقا کے شاگرد تھے۔ راجہ نند رام پنڈت صاحب علم و استعداد اور خط شکست کے ماہر تھے۔ لالہ لچھمی رام پنڈت عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے، فارسی کے بہترین انشا پرداز تھے، خط نستعلیق اور شکست وغیرہ میں محمد حفیظ خان کے شاگرد تھے۔ خوش وقت رائے دانگی قوم کے کھتری تھے، خوش نویسی میں کمال حاصل تھا، شکست میں مہر علی سے اور نستعلیق میں شاہ اعز الدین سے اصلاح لی تھی۔ لالہ درگا پرشاد کایستھ کا لکھنؤ وطن تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم کے شاگرد تھے، خط نسخ اور شکست اتنا عمدہ لکھتے تھے کہ کہ گویا موتی پروتے تھے، شاعر بھی تھے، مضطرب تخلص تھا۔

شنکر ناتھ کشمیری پنڈت مشہور خوش نویس اور شاعر تھے، مؤدب تخلص تھا۔ لالہ سرپ سنگھ دیوانہ خوش خطی میں حافظ نور اللہ کے شاگرد تھے، شاعر بھی تھے، اردو، فارسی، اور ہندی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، خوش خطی میں استاد کا چربہ ایسا اڑایا تھا کہ سیکڑوں وصلیاں لکھ کر ان کے نام سے پھیلا دیں، جن میں بڑے بڑے ماہر تمیز نہیں کر سکتے تھے، مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ حافظ نور اللہ و قاضی نعمت اللہ کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان اور ہزاروں کایستھ جن سے ''نوبستہ اور اشرف آباد'' کے محلے بھرے ہوئے ہیں ان سے سیکڑوں کشمیری پنڈت خوش نویس ہوگئے، جن کا تفصیلی ذکر مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنی مشہور کتاب ''مسلم دور حکمرانی کے تمدنی کارنامے'' مطبوعہ دار المصنفین، اعظم گڈھ میں کیا ہے۔ سب کا احاطہ دشوار ہے اور نہ سب کا تعارف ممکن ہے، ان ناموں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں نے وقت کی زبان سیکھ کر اس میں شاعری کی اور اس زبان میں مشق خوش نویسی کا فن حاصل کر کے اپنی محنت سے کمال اور درک حاصل کر کے استادی کے درجہ تک پہنچ گئے، اور اردو و فارسی زبان کے سیکھنے سکھانے اور اس کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

☆☆☆

انصار احمد معروفی
پورہ معروف۔ بلوہ، کورتھی جعفر پور۔ ضلع
مئو 275305۔ یوپی، بھارت
موبائل : 8853214848




مضامین

# حافظ شیرازی اور غالبؔ دہلوی کی شاعری کا تقابلی جائزہ

**تمہید:** ادب میں تقابلی مطالعہ یعنی (Comparative Study in literature) اگرچہ فرانسیسی ادب سے فارسی اور اردو ادب میں داخل ہوا لیکن ادب کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ تقابلی مطالعہ کے معنی ایک ادب کی تاثیر دوسری ادب پر اور دو ادب کے درمیاں مشابہتیں اور یکسانیت کا قیاس کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دو ادب کے درمیان تقابلی مطالعہ، اور ان کے درمیان متشکل اور مشترک عناصر کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس راستے میں جتنی تحقیق کی جائے گی اتنی ہی دو قوموں کے درمیان ثقافتی تعلقات بڑھتے جائیں گے۔ اب فارسی کی غزل کے بادشاہ آٹھویں صدی ہجری قمری کے عظیم شاعر خواجہ شمس الدّین محمد حافظ شیرازی اور اردو غزل کے بادشاہ اٹھارویں صدی عیسوی کے شاعر مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی کے اردو اور فارسی عرفانی غزلیات کی مفہومی تشریحات کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ حافظ شیرازی اور غالب دہلوی ایران و ہندوستان کے مایہ ناز شاعر ہیں، جن کا شمار صف اول کے مقتدر ترین شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے صاحب نظر اور صاحب شعور شاعر ہیں۔ حافظ اور غالب کی شاعری میں رمز بہ انداز رمز در اصل کنایہ کی ایک قسم ہے۔ بعض دشوار پسندی ہے یعنی معمولی مضامین کو مشکل انداز میں بیان کرتے ہیں اور اس کی کئی صورتیں ہیں۔ انداز بیان دونوں شعراء کے اشعار میں کمال تک ہے۔ ان کی شاعری میں ایجاز ہے جو دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ اور ان کے کلام میں ظرافت کا پہلو ہے جو ان کے مزاج سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حافظ اور غالب کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ویسا ہی ذہن رسا ہونا چاہیے۔ غالب اور حافظ فکر و تخیل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ تصوّف، عشق و محبت، رندانہ شوخی، رمز، قول محال اور تاثیر کلام میں حافظ کو فوقیت حاصل ہے مگر پیچیدہ بیانی اور تکلف پسندی کی فروگزاشتیں، طنز، خیالات کی بلند پروازی اور جدّت طرازی میں بھی غالب امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ حُسن و عشق، اخلاقیات، زبان کی صفائی، بیان کی سادگی و بے تکلفی، جذبات نگاری اور محاورہ میں دونوں برابر ہیں۔

**مقدمہ:** مورخوں کے نزدیک حافظ اور غالب کے دور سماجی اور سیاسی لحاظ سے تاریخ کے سب سے زیادہ تاریک دور تھا۔ یعنی ایران میں مغلوں اور ہندوستان میں انگریزوں کے حملے نے ان کی زندگی میں کافی حد تک تاثیر کی تھی۔ عام طور پر غالب اور حافظ کے اشعار کے مفہوم میں خاص معنوی اور مجازی بیان موجود ہیں۔ اس کی علت بھی ان کی سماجی اور سیاسی دور ہے۔ غالب اور حافظ دونوں ملامت کرنے والے شاعر ہیں اور یہ ملامت گری ان کے اشعار کے مفہوم میں ان کی عرفانی نکتہ نظر سے ہے۔ دونوں شعرا کے کلام میں رمز، قول محال، ایماء، استعارہ اور پراڈوکس بھرپور نمایاں ہے۔ حافظ اور غالب اپنی شاعری میں اندرونی جذباتی زندگی کی داستان بیان کرتے ہیں:

**غم عشق اور غم روزگار:** حافظ و غالب کی رباعی میں غم کا موضوع نمایاں ہے، حسب ذیل رباعیوں پر غور کریں:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل زک زک کر بند ہو گیا ہے

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی ہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب
(غالبؔ)

من حاصل عمر خود ندارم جز غم
در عشق ز نیک و بد ندارم جز غم

مضامین

یک ہمدم با وفا ندیدم جز درد
یک مونس نامرد ندارم جز غم

(حافظ رباعی 31)

حافظ شیرازی اور غالب کی نظر میں فلسفہ غم ایک اور مشترک مضمون ہے۔ اگر اس مضمون کو فن شعر عائد کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر قادرالکلام شاعر بعد میں آنے والوں کے لیے کسی قدر راستے صاف کر جاتا ہے۔ حافظ اور غالب کے اشعار میں سب قسم کے غم ملتے ہیں۔ اس عشق کا غم بھی ہے، جسے مادی اور جسمانی سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں۔ نا قدر تی عالم کی شکایت بھی ہے۔ ہر قسم کے غم عشق اور غم روزگار کی آمیزش بھی ہے۔ مثال کے طور پر:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

(غالب)

پیوند عمر بستہ مویست ہوش دار
غمخوار خویش باش غم روزگار چیست؟

(حافظ، غزل 54)

یعنی: عمر کا جوڑ بال سے ہے ہوش کر اور خیال رکھ اور اپنا آپ کے غمخوار بن جا، زمانہ کا غم کیا ہے؟

**گریہ سحری:** حافظ شیرازی اور غالب دہلوی دونوں کے نزدیک وگریہ سحری اور آہ نیم شب کا ذکر ملتا ہے۔ دونوں کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سحر خیز تھے۔ گریہ سحری دونوں کی عبادت اور عبودیت کا جز ہیں:

می صبوح و شکر خواب صبحدم تا چند
بعد ز نیم شبی کوش و گریہ سحری

(حافظ، غزل 553)

یعنی: صبوحی شراب، اور صبح کی میٹھی نیند کب تک؟ آدھی رات کے وقت عذر اور صبح کی گریہ وزاری کی کوشش کر۔

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

(غالب)

دونوں شعراء کا کہنا ہے کہ شب خیزی اور گریہ سحری کی زحمت برداشت کرتا کہ صبح ہوتے ہوتے تجھے عالم قدس سے بشارت کی دولت حاصل ہو جائے اور تیرے سب بگڑے ہوئے کام بن جائیں۔ یہ تکلیف اور زحمت شخصیت کے جوہر نکھارتی اور روحانی ارتقاء کا راستہ صاف اور ہموار کرتی ہے۔ عالم قدس ارتقاء کی اعلا ترین منزل ہے جس کی جانب زندگی رواں دواں اور کبھی کشاں کشاں بڑھتی ہے یہ ارضیت کے منافی نہیں بلکہ اس کی تکمیل ہے غالب و حافظ کا اندوہ برداشت کرنے کا تصور کی ہے اور اس کے ڈانڈے اس کی پُر اسرار روحانیت سے ملی ہو۔ حافظ اور غالب کا کہنا ہے: اے دل اس درد و الم سے بیزار نہ ہو اسے غنیمت سمجھ وہ وقت آنے والا ہے کہ میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ نہ صبح کا گریہ رہے گا۔ نہ آدھی رات کے وقت کی آہیں رہیں گی۔

**دنیا کی بے ثباتی:** حافظ شیرازی اور غالب دہلوی دونوں نے دنیا کی ناپائداری کو اجاگر کرنے کو اسے سرائے سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح آدمی سرائے میں عارضی طور پر دو دن چار دن ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا کی زندگی بھی چند روزہ ہے۔ اس چند روزہ زندگی کو بامعنی بنانے کی پوری کوشش کرنی

مضامین

چاہیے۔حافظ اور غالب دونوں نے دنیا کی ناپائداری کو اجاگر کرنے کو اسے حلقہ دام خیال، دام ہلا، بازیچہ اطفال، دنیائے فراغ سے تشبیہ دی ہیں۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلق دامِ خیال ہے

(غالب)

بیا کہ قصر امل سخت ست بنیادست
بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر بادست

(دیوان حافظ، غزل 37، بیت 1)

یعنی: آ جا کیونکہ تمناؤں کے محل کی بنیاد بہت کمزور ہے شراب لے آ عمر کی بنیاد ہوا میں قائم ہے۔

خرم آن روز کز این منزل ویران بروم
راحت جان طلبم و از پی جانان بروم

(دیوان حافظ، غزل 359)

یعنی: مبارک ہوگا اس دن جب کہ میں اس ویران مکان سے جاؤں گا' جان کی راحت طلب کروں گا اور جاناں کے پیچھے جاؤں گا۔

اعتمادی نیست بر کار جہان
بلکہ بر گردون گردان نیز ہم

(دیوان حافظ، غزل 363، بیت

یعنی: دنیا کے کام پر کوئی بھروسہ نہیں ہے بلکہ چکر کھانے والے آسمان پر بھی۔

**خشک زہد:** زاہدان خشک سے نہ صرف حافظ اور غالب بیزار ہیں بلکہ پاکباز صوفی بھی بیزار رہتا ہے۔ غالب اور حافظ کو یہ شکایت ہے کہ زاہدان خشک نے مذہب کو بیوست کا ہم معنی بنا دیا ہے اور یہ لوگ ذوق لطیف سے محروم ہیں۔ظواہر کے چھلکے کھاتے ہیں اور باطن کے مغز سے لذت آشنا نہیں ہوتے ہیں۔ غالب و حافظ کہتے ہیں: زاہدا گر شراب کو پسند نہیں کرتا تو درست۔ کیونکہ شراب شرع میں حرام ہے۔لیکن بذلہ سنجی اور ظرافت کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا۔حتی کہ نبی کریم (ص) کے دور میں بعض صحابہ بھی کبھی کبھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔لیکن بعض زاہدوں کی خشکی کا یہ حال ہے کہ نہ ان کی طبیعت بذلہ آفرین ہوتی ہے اور نہ لطیفہ سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔بعض اوقات تو لطیفے کی لطافت ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ جو شخص جس چیز سے بے بہرہ ہوتا ہے وہ اس پر طعنہ زنی شروع کر دیتا ہے۔ حافظ و غالب کے مشترک اشعار اس حوالے سے:۔

ز زہد خشک ملولم کجاست بادہ ناب
کہ بوی بادہ مدامم دماغ تر دارد

(دیوان کہنہ حافظ، غزل 116، بیت 5)

میں خشک زہد سے رنجیدہ اور بیزار ہوں خالص شراب لاؤ اس لیے کہ شراب کی خوشبو میرے دماغ کو سدا تر و تازہ رکھتی ہے۔

مضامین

اے زہد خشک تیری ہدایت کے واسطے
سوغات عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم
(غالب)

معبد اب سارے گرتے آتے ہیں
زاہد خشک ڈوبے جاتے ہیں
(غالب)

حافظ و غالب دنیا کے ریا کار واعظوں، غیر واقعی زاہدوں اور زاہدان خشک سے تھکے ہوئے دنیا سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ حافظ نے فرار میں نجات چاہی تو اس لیے کڑوی شراب مانگتا ہے اور کہتا ہے:

شراب تلخ مئے خواہم کہ مردافکن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش
(حافظ، غزل 324)

یعنی: میں ایسی کڑوی شراب چاہتا ہوں جس کا زور مردافکن ہوتا کہ دنیا اور اس کے شور شر سے ذرہ آرام پاوں۔

کوں ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد
(غالب)

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں جب سے میں مر گیا ہوں مے مردافکن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے
(غالب)

**تصوف:** خواجہ حافظ شیرازی اور مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی تصوف کے اس عام عقیدے کو قبول کرتے ہیں، کہ ذات باری تعالی ہی حقیقت مطلق اور حُسن مطلق ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ کائنات کی تخلیق کے پہلے دن (روز ازل) اللہ تعالی نے تمام مخلوقات میں سے انسان کو ہی اپنے بار امانت سے سرفراز کیا۔ دونوں شعراء کے اشعار میں یہ مشترک بات ظاہر ہے:۔

گرنی تھی ہم پہ برق بجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
(غالب)

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند
(دیوان حافظ، غزل 184)

یعنی:

آسمان امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا
مجھ دیوانے کے نام، انہوں نے فال کا قرعہ نکال دیا

**خونین کفن یا خونچکاں کفن:** اگر غور کیا جائے اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حافظ اور غالب کے لاشعور کی تہ میں غم اور ملال کی پرچھائیاں موجود تھیں۔ ایک عظیم فن کار کی حیثیت سے وہ غم کی تخلیقی خاصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ خونین کفن کے حوالے سے حافظ اور غالب کا کہنا ہے:

با صبا در چمن لالہ سحر می گفتم
کہ شہیدان کہ اند این ہمہ خونین کفنان
(حافظ، غزل 387)

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
(غالب)

حافظ اور غالب نے واعظ، زاہد، فقیہ، محتسب، شحنہ اور صوفی کا پردہ فاش کیا اور ان کی ریاکاری پر سخت تنقید کی، اس لیے نہیں کہ وہ دین اور مذہب کے خلاف ہیں بلکہ اس واسطے کہ ان میں حقیقی روحانیت اور اخلاص کی کمی ہے۔ اکثر اوقات وہ اہل اقتدار سے ساز باز کر کے اجتماعی زندگی میں بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ حافظ و غالب نے واعظ و زاہد کو اپنی تنقید کا نشانہ اس لیے بھی بنایا کہ ان کی نظر بس ظواہر تک محدود رہتی ہے۔ وہ دوسروں میں عیب نکالتے ہیں لیکن خود اپنے اعمال کا احتساب نہیں کرتے، یعنی منہ میں رام رام، بغل میں چھری۔ ان کی بے توفیقی اور ظاہر پرستی حقیقت کو ان کی نظر سے اجھل رکھتی ہے۔ حافظ کی تنقید و تعریض استعارے کے حسین لباس میں ملبوس ہے اس لیے کہیں بھی ذوق پر گراں نہیں گزرتی:

واعظان کاین جلوہ در محراب و منبر می کنند
چون بہ خلوت می روند آن کار دیگر می کنند
(دیوان حافظ، غزل 199)

یعنی یہ واعظ حضرات جو محراب اور منبر پر جلوہ گری کرتے ہیں جب تنہائی میں جاتے ہیں تو کچھ اور کام کرتے ہیں:

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
(دیوان غالب، غزل 23، سطر 9، ص 41)

یعنی واعظ کو مے خانے اور شراب نوشی سے کیا تعلق۔ ہاں اتنی بات ہمیں معلوم ہے کہ کل وہ ادھر جا تا تھا اور ہم وہاں سے نکلے تھے۔ گویا میدان خالی دیکھ کر چوری چھپے پینے کی عادت ہوگی۔ شعر رندانہ ہے مگر اسلوب بیان بہت دل کش اور نادر ہے۔

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوی داد
کہ می حرام ولی بہ زمال اوقاف است
(حافظ، غزل 92)

یعنی: مفت کی شراب قاضی (فقیہ) کو بھی حلال ہے۔

حافظ اور غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ان کے فرزند عزیز نے جوانی میں انتقال کیے اور اپنے باپ کے دل پر داغ دیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل سے اپنے گھر اور اہل خانہ کی محبت کم نہ ہوئی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

دلا دیدی کہ آن فرزانہ فرزند چہ دید اندر
خم این طاق رنگین
بجای لوح سیمین در کنارش فلک برسر نہادش لوح سنگین

معنی: کیا اے دل تو نے دیکھا کہ یہ عقلمند بینا عالم ہستی میں اس نے کیا محسوس کیا کہ اپنے ساتھ چاندی تختی (معشوق) کے بجائے فلک نے اس کے سر پر لوح مزار رکھا۔ مرزا صاحب کی اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لئے ایک مدت سے وہ اور انکی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر غدر سے چند سال پہلے جبکہ ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا انتقال ہوگیا، اور ان کے دونوں بچے ایک باقر علی خان اور دوسرے حسین علی خان صغیر سن رہ گئے تو مرزا ان کی بی بی کے چھوٹے لڑکے حسین علی خان کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔ غالب مرثیہ عارف کے ایک حصے میں کہتے ہیں:

ہاں اے فلک پیر! جوان تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہ روایت مشہور ہے کہ حافظ کے انتقال کے بعد بعض فقہا نے کہا کہ ان کے علانیہ فسق کی وجہ سے ان کی نماز جنازہ جائز نہیں۔ شیراز شہر کے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا کہ اسے مسلمانوں کے طریقے سے دفنانا چاہیے یا غیر مسلمانوں کے رواج اور طریقے سے۔ شاہ منصور والی شیراز بھی جنازے کے ساتھ تھا۔ اس نے شہر کے فقیہوں سے کہا کہ اس کی بے دینی ثابت کرو۔ انھوں نے کہا اس کا دیوان اٹھا کر کہیں سے ورق الٹ لیجے، جب دیوان کھولا گیا تو صفحے پر سب سے پہلا یہ شعر تھا:

قدم دریغ مدار از جنازہ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہ است، می رود بہ بہشت
(غزل 39)

یعنی: حافظ کے جنازے کے پیچھے قدم اٹھاو اور آو اگر چہ حافظ ایک گنہگار آدمی ہے لیکن اس کے باوجود جنت جائے گا۔ اسی طرح جب غالب نے وفات پائی لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا، بعض لوگوں نے کہا غالب شیعہ تھا' شیعوں کے مطابق تکفین اور تدفین کرنا ہے اور بعض لوگ کہنے لگے کہ اہل سنت کے طریقے کے مطابق تکفین اور تدفین کرنا ہے۔ مگر کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑہتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاو سنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔

**کتابیات:**

1-ذبیح اللہ صفا، فارسی ادب کے ارتقاء کی مختصر تاریخ، انتشارات امیر کبیر، تہران، 2000ء 2-حالی خواجہ الطاف حسین، یادگار غالب، ناشر ٹمر آفسٹ پریس، دہلی، 1986' 3-افشار، ایرج، دیوان کہنہ حافظ، انتشارات امیر کبیر، تہران، 1366ھ ش' 4-عرشی، امتیاز علی خان، دیوان غالب اردو، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور، 1992ء
5-نعمانی، علامہ شبلی، شعر العجم، حصہ دوم، ناشر دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، 2011ء

☆☆☆

سلیمان زراع' اردو پی ایچ-ڈی اسکالر' شعبہ اردو مانو-تہران-ایران' ای میل: suleymanzare@ut.ac.ir

مضامین

# ردِ نوآبادیات اور ترقی پسند اردو افسانہ



نوآبادیات ایک تاریخی عمل تھا جس کا اختتام بیسویں صدی کے نصف اول کے ساتھ ہوا۔ نوآبادیات کا اطلاق عام طور پر دنیا کے ان مقبوضات پر ہوتا ہے جو ایک طویل عرصے تک یورپ کے زیرنگین رہے ہیں۔ مستعمریت کے عمل میں یورپ یا مغرب نے ایشیاء وافریقہ اور شمالی امریکہ میں صدیوں تک اپنی اجارہ داری سے مقامی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔ تاریخی تناظر میں نوآبادیاتی عمل بنیادی طور پر معاشی برتری وخودکفیلی سے شروع ہوا جس میں مرور زمانہ کے ساتھ توسیع حکومت بھی شامل ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی کو یرغمال بنا کر انہیں بنیادی انسانی حقوق واوصاف سے یکسر محروم کر دیا گیا۔ تیسری محکوم دنیا کے انسان کو علم سے مہذب بنانے کو نوآبادکار نے اپنا فرض منصبی پر محمول کیا۔ جس سے دنیا میں یورپ نے اپنے مزموم نوآبادیاتی عمل کو جائز اور صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ برصغیر صدیوں نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط رہا ہے۔ وطن عزیز ہندوستان بھی برطانوی نوآبادیات کے پُرکٹھن اور صبر آزما دور سے گزرا ہے۔ جب پرتگالیوں اور ولندیزوں کو انگریزوں نے اس دوڑ میں ہرا کر تاجروں کے بھیس میں لوٹ کر اس پر اپنی حکومت قائم کی۔ انگریزی استعمار میں اہل ہند کی کسمپرسی اپنی انتہائیوں کو چھوگئی۔ حاکم کی مقرر کردہ راہوں پہ چلتے چلاتے محکوم اپنی پہچان سے بالکل عاری ہوگیا۔ یوں نوآبادیات کے ثمرات میں ایک عظیم الشان ملک وقوم کی تابناک تاریخ وتہذیب خود ان کے آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ ہند کے کہنہ مشق انگریزوں کی کلرکی میں نوآبادیاتی بیانیہ کے محرر ہوگئے۔ ناصر عباس نیر نوآبادیاتی صورتحال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نوآبادیاتی صورتحال فطری اور منطقی صورتحال نہیں ہے۔ یہ ازخود کسی قابل فہم فطری قانون کے تحت رونما نہیں ہوتی۔ ہر چند اس کی رونمائی تاریخ کے ایک خاص لمحے میں ہوتی ہے مگر تاریخ کا یہ لمحہ کسی الہامی حکم یا فطری طاقتوں کے اپنے قوانین کی ''پیداوار'' نہیں ہوتا۔ اسے ''پیدا'' کیا جاتا ہے اور تشکیل دیا جاتا ہے۔ چوں کہ ''پیدا'' کیا جاتا ہے، اس لیے مخصوص مقاصد کے حصول کو سامنے رکھا جاتا ہے، لہذا کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کے خاطر برپا ہونے والی صورتحال ہے۔'' (ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، انجمن ترقی اردو، دہلی 2015۔ ص31)

جسم کی محکومیت سے بڑھ کر ذہنی غلامی کا مرض اس قوم کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ شعوری وغیر شعوری طور پر پورا ہندوستانی معاشرہ مقید و مضمحل تھا جس کا اثر یہاں کے علم وعمل میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں کے بعد ہندوستان میں انگریزی نوآبادیات زوال کی اور بڑھ رہی تھی، نہ صرف یہاں بلکہ پوری دنیا میں بیداری اور آزادی کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ انگریزوں کے ظلم وستم سے جوج رہے اہل ہند بھی حریت کی جنگ کو بڑے منظم طریقے سے آگے بڑھا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعی ترجمانی مقدم ٹھہری اور ادب اور سیاست کی دوئی کو مٹا کر اسے حالات دوراں کا ترجمان بنایا گیا۔ سماج کے نچلے طبقہ کے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے مقامی لوگوں کو حاکمِ وقت کے ظلم وجبر کا ادراک کرایا گیا۔ اردو ادب کی تحریکات میں ترقی پسند تحریک پہلی ایسی جامع اور واحد تحریک تھی جس نے ادب کے مختلف ابعاد کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ سوچنے اور سمجھنے کی نئی راہوں کو وا کیا۔ ادب کی تمام اصناف میں موضوع ومواد کی سطح پر ایک خوشگوار تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ ادیب پہلی بار کسی سماج کا پروردہ لگا اور اس طرح اپنے گردوپیش میں ہو رہے تبدیلیوں کا عکس ہمارے ادب کا بنیادی حصہ بن گیا۔ شاعری میں جہاں سماجی تصویر اجاگر ہوئی وہیں نثری اصناف میں بھی خارجی صورتحال کی عکاسی ہونے لگی۔ اردو کے افسانوی ادب میں صنف داستان اپنے دن گزار چکی تھی لہذا اردو ناول اور افسانہ میں ہر جگہ معاصر سماجی، سیاسی نیز تہذیبی صورتحال کی روداد رقم ہونے لگی۔ اردو ترقی پسند افسانے میں ہندوستانی سماج کی تمام ظاہری وباطنی کارگزاری کو واضح طور پر بیان کیا گیا۔ چاہے وہ لوگوں کی انفرادی زندگی کا مسئلہ ہو یا اجتماعی، غرض بھوک سے محکومیت کا تمام منظرنامہ ترقی پسند اردو افسانہ کی دستاویزی فائل کا بنیادی باب بن گیا۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے اردو افسانہ قومی دھارے کی نمائندگی نہیں کر سکا تھا۔ اس سے پہلے رومانوی اور داستانی عناصر کی یلغار سے صنف افسانہ موضوع کی سطح پر مقید تھا اور اس کا فن بھی واضح نہیں تھا۔ ترقی پسند تحریک نے ہم عصر زندگی کا نقشہ کھینچتے

ہوئے ادب کو انسانی زندگی کے قریب تر کر دیا۔ ہندوستان اس وقت انگریزوں کی غلامی کے دور سیاہی سے گزر رہا تھا۔ لہذا اس وقت اردو ادب میں صاف طور سے نوآبادیات کے خلاف احتجاج کا رجحان جاری ہوا۔ انسان کی عزت نفس اور انسانیت کے تقدس پر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جس بے لاگ طریقے سے لکھا اس کی نظیر اردو ادب کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی ہے۔ غلامی کو تمام مسائل و مشکلات کا منبع سمجھتے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس کے خلاف کھل کر مزاحمت کی۔ حریت و آزادی اردو افسانے کا مستقل موضوع بن گیا۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''ترقی پسند تحریک نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک واضح نصب العین لے کر میدان میں اتری اور ادب میں ردِنوآبادیاتی تحریروں کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔'' (محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور، 2016، ص 117)

صنف افسانہ کا قلیل وقت میں ہمارے ادب میں مستند جگہ پانا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس میں ہئیت و موضوع کی سطح پر ہمیشہ بہتر سے احسن بننے اور پھر ہر طرح کی پیشکش سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود رہی ہے۔ ترقی پسند افسانہ میں فرد کی داستان حیات سے لے کر پوری ہندوستانی زندگی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منشی پریم چند اس کارواں کے روح رواں ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے فن میں وطن اور اہل وطن کی ترجمانی کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ ان کے افسانوی متون میں جس طرح ہندوستانی سماج کی عکاسی کی گئی ہے وہ انہیں کا خاصہ ہیں۔ حقیقت نگاری کی جس بلند سطح پر وہ قاری کے سامنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کی شرح کرتے ہیں اسے ان کی فنی عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔ اندازہ کر لیجئے پریم چند کے افسانے قابل تفتیش سمجھ لیے جاتے ہیں اور ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'سوز وطن' 1908ء کو جس میں بغاوت کی بُو حکومت وقت کو محسوس ہوئی اس سے ضبط کیا جاتا ہے۔ سوز وطن جیسے کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اہل وطن کے درد و کسک کی نشاندہی کرتے ہوئے مزاحمت کا علاج تجویز کیا گیا ہے۔ عزت نفس کے لیے خون کے قطرے کو بہانا انسانی معراج قرار پاتا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں سماجی و معاشرتی مسائل کے ساتھ اصلاحی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ اپنے لوگوں پر نوآبادیاتی آقاؤں کی سفاکیت و بربریت کو رقم کرتے آزادی کی ترجمانی کی۔ ان کے ہر افسانوی مجموعے میں بدیسی آقاؤں کے خلاف زوردار احتجاج مختلف صورتوں اور سطحوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' میں آنسو کے قطرے اور مشت خاک کو ٹھکرا کر خون کے آخری قطرے کا انتخاب کرنا دراصل پریم چند کا اہل ہند کو دعوت عزمیت پیش کرنا ہے:

''وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے انمول بیش قیمت شئے ہے''

افسانہ ''شیخ مخمور'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ تیغہ میں نے پدر بزرگوار سے ورثہ میں پایا ہے اور یہ میری گذشتہ عظمت کی آخری یادگار ہے۔ یہ میرا قوت بازو اور میرا معین و مددگار ہے۔ اس کے ساتھ کیسی کیسی یادگاریں وابستہ ہیں۔ کیا میں جیتے جی اسے اپنے پہلو سے جدا کروں''۔

افسانوی مجموعہ ''خواب و خیال'' میں شامل افسانہ ''لال فیتہ'' ردِنوآبادیات سے عبارت ہے۔ جس کا مرکزی کردار ڈپٹی مجسٹریٹ ہری بلاس اپنے ملک اور لوگوں کے لیے نوآبادیات کار کا حلیف و مددگار بننے کے بجائے تحریک آزادی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ کردار دنیاوی مفاد پر لات مار کر جدوجہد اور حریت کا علم بلند کرتا ہے۔ ان مختصراً اقتباسات پر غور و فکر کریں:

''خلاصہ مجھے قوم کے دوستوں اور خادموں کا دشمن بننا چاہیے۔''

''میرا منصبی تعلق عارضی ہے۔ وطنی تعلق دائمی ہے۔''

''رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری میں کے قاتل ہیں۔ ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنی ہے۔''

اس قبیل کے اور بہت سارے افسانے پریم چند کی بالیدہ فکر کی غمازی کرتے ہوئے گورے حاکمین کی اجارہ داری کی کو رد کرتے ہیں۔

مضامین

پریم چنداسی بدولت نوآبادیات کے خلاف لکھنے والوں میں اولین درجے کے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''پریم چند پہلے فکشن نگار ہیں جنھوں نے عام آدمی کی پزیرائی کی۔انہوں نے نچلے درجے کے کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کے مسائل خصوصاً دیہاتیوں میں آبیانہ، لگان وغیرہ کے معاملات پر پائی جانی والی بے چینی اور اس طبقے کی سیاسی شعور کو اہمیت دی۔نوآبادیاتی نظام کے خلاف وطن پرستی کے جذبات کا اظہار کر کے انہوں نے مجموعی سیاسی فضا کی عکاسی کی''۔ (رشید امجد، ڈاکٹر،اردو افسانہ اور عصری آگہی، مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ ۸،ص ۵۷۳)

ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں اپنے وطن کے تئیں والہانہ عقیدت ملتی ہے جس کا اظہار ہر افسانہ نگار کی نگارشات سے ہوتا ہے۔جنھوں نے سماج کے متوسط اور نچلے طبقے کے درپیش مسائل کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کے بہترین مستقبل کی تشکیل کے لیے اپنے فن کو ہمیشہ وقف رکھا۔کرشن چندر اس قبیل کے افسانہ نگاروں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔کرشن چندر جس کے بارے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اردو افسانے کی تاریخ میں کئی افسانہ نگار ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو کئی موڑ عطا کیے۔ان افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام کرشن چندر کا ہے۔ان کا نام ذہن میں آتے ہی ترقی پسند تحریک نگاہوں میں براجمان ہو جاتی ہے۔فکشن کی حد تک ہم ترقی پسند تحریک اور کرشن چندر کو ایک ہی سکہ کے دو رپہلو کہہ سکتے ہے۔'' (اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ایچ ایس آفسٹ پرنٹرس، دہلی، 2002،ص26)

کرشن چندر کے افسانوں میں متنوع موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ فطرت کے شناور کی حیثیت سے رومانوی سجاوٹ سے جہاں قاری کو قدم قدم پر محظوظ ومحفوظ کرتے ہیں وہیں ان کے یہاں نوآبادیاتی نظم ونسق کی مخالفت کا احساس بھی الفاظ میں ڈھل جاتا ہے۔ان کے افسانوں کی خمیر گردوپیش کے ماحول سے تیار ہوتی ہے۔کرشن چندر کے افسانوی کائنات مختلف رنگوں سے بھری پڑی ہے لیکن وہ کسی بھی طرح مظلومیت کی سیاہی سے اپنے ہم وطنوں کی آہ وفغاں کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔آپ جب بھی محکومیت کے بارے میں لکھتے ہیں تو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان کے افسانے کسی تازیانے سے کم نہیں ہیں جو نہ صرف گزرے کل کی ابتری کی طرف اشارہ کرتے بلکہ آنے والے صبح کی بہتری پر اکساتے ہیں۔ان کے اسلوب میں اتنی ہمواری اور اثر پزیری ہے کہ قارئین بڑے جوش وجذبے کے ساتھ ان کی تحریر کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔جس کی شدت اور اپنائیت کا جذبہ پڑھے لکھے ذہین قاری کو متاثر کرتا ہے۔ان کا مشہور افسانہ''امرتسر آزادی سے پہلے'' میں وہ کس طرح ہندوستانیوں کا بحیثیت ایک قوم انگریزوں کی غلامی کے خلاف جدوجہد کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''جلیانوالہ باغ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔اس مجمع میں ہندو تھے سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔ہندو مسلمان سے اور مسلمان سکھوں سے صاف پہچانے جا سکتے تھے۔صورتیں الگ تھیں، مزاج الگ تھے، تہذیبیں الگ تھیں۔مذہب الگ تھے۔لیکن آج یہ سب جلیانوالہ باغ میں ایک ہی دل لے کر آئے تھے۔اس دل میں ایک ہی جذبہ تھا اور اس جذبے کی تیز اور تند آنچ نے مختلف تمدن اور سماج ایک کر دیئے تھے۔۔۔جو ہر لمحے کے ساتھ گویا کہتی جاتی ہے۔آزادی، آزادی۔''

قاری کو کرشن چندر کے افسانوں کے بین السطور مطالعے کے بعد ایشاء وار دو کے اس عظیم افسانہ نگار کے فکر وفن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔اس کی ایک تصویر ان کے افسانوی مجموعہ'ہم وحشی ہیں' کے ایک دوسرے افسانے''امرتسر آزادی کے بعد'' میں ملاحظ فرمائیں:

"انگریزوں کے راج میں ایک پستول بھی بھولے سے کہیں نہیں ملتا تھا اور آزادی کی پہلی ہی رات نہ جانے کہاں سے یہ اتنے سارے بمب، ہینڈ گرینیڈ' مشین گن، اسٹین گن، برین گن، ٹپک پڑے۔یہ اسلحہ جات برطانوی اور امریکی کمپنیوں کے بنائے ہوئے تھے اور آج رات ہندوستانیوں کے دل چھیدر ہے تھے۔لڑے جاؤ، بہادرو۔مرے جاؤ بہادرو"۔

کرشن چندر کے ہاں ہند کی سیاسی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد 'نیا نوآبادیاتی نظام' کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں جس سے یورپ

اور موجودہ عالمی طاقتیں ہنوز اپنے ممالک سے ایشیاء کی تیسری دنیا کو تاراج کر رہے ہیں اور برصغیر اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جس صورت حال سے موجودہ دنیا جوجھ رہی ہیں اس کا عکس درج بالا افسانے کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''ایشیاء کی عزت برقرار رکھو۔ لڑتے جاؤ بہادرو۔ تم نے لڑنا بند کر دیا تو ایشیاء کا رخ دوسری طرف پلٹ جائے گا اور پھر ہمارے کارخانوں کے منافعے اور حصے ہماری سامراجی خوشحالی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لڑے جاؤ بہادرو۔ پہلے تم ہمارے ملکوں میں کپڑا اور شیشے کا سامان اور عطریات منگاتے تھے، اب ہم تمہیں اسلحہ جات بھیجیں گے اور بم اور ہوائی جہاز اور کارتوس کیونکہ اب تم آزاد ہوگئے ہو''۔

کرشن چندر کے افسانے ''اندھے'' اور ''جیکسن'' میں انگریزوں کی عیاریاں بے نقاب کی گئی ہیں کہ کس طرح وہ یہاں کے باشندوں کو آپس میں لڑا کر ان پر حکومت کر رہے تھے۔ افسانہ'' دو فرلمبی سڑک'' میں محکومیت اور مظلومیت کی ایک دکھ بھری تصویر ابھرتی ہے۔ غرض ترقی پسند تحریک کی افسانوی کائنات صرف بھوک اور پیاس کی حدود میں سفر نہیں کرتی بلکہ ان تمام عوامل کا تجزیہ کرتی ہے جن کی وجہ سے پورے ہندوستان میں اس وقت ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ ظاہری بات ہے کہ ان سب کے پیچھے وطن کی محکومیت ومظلومیت بنیادی مسئلہ تھا جس نے ہندوستان کے باشندوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ مظلومیت ومحکومیت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ وہ زندگی کی دوڑ سے بالکل باہر تھے اور بددلی اتنی تھی کہ اپنی حالتِ زار پر قناعت کئے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے اپنے درخشاں ماضی کا تصور بالکل مٹ چکا تھا۔ وہ نوآبادکار کے ہاتھوں مختلف طریقوں سے استحصال کے شکار ہو رہے تھے۔ ترقی پسند افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں نوآبادیاتی بیانیہ کا توڑ کرتے ہوئے ان اوقات میں قوم کو جگا رہے تھے۔ اگرچہ یہ تحریک فکری سطح پر کارل مارکس کے نظریات سے مربوط ومنسلک تھی لیکن مشرقیت اور وطن کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور جاندار روایت پر فخر اردو ترقی پسند تحریک کا لازوال حصہ رہا ہے۔ جس کا اظہار ادب کی ہر صنف میں ہوا بڑے جاندار طریقے سے ہوا ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو کے فکر وفن کا چرچا عام ہے۔ ان کی کہانیوں میں بھی حاکمِ وقت کی چیرہ دستیوں کے خلاف مختلف سطحوں اور صورتوں میں مزاحمت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہمارے یہاں منٹو کے افسانوی متون کی سپاٹ قرات سے ان کے فن کو مقید کر دیا گیا۔ اگرچہ ان کی افسانوی کائنات میں جنس اور عورت غالب موضوع رہا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی کے باقی معاملات سے نابلد رہے ہیں یا انہوں نے ان کے متعلق غور وفکر نہیں کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو جیسی فراست بہت کم افسانہ نگاروں کا حصہ رہی ہے۔ وہ اپنے گرد وپیش میں ہو رہے ہر ایک معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نوآبادیاتی منصوبوں اور ان سے پیدہ شدہ مسائل کی بازگشت ہر آن سنائی دے دیتی ہے۔ منٹو اپنے اچھوتے اور نرالے انداز میں غلاموں کی نفسیات کا بڑے بہترین انداز میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ منٹو نے جہاں بھی اپنے عصر کے ملکی حالات میں بدامنی اور بےچینی کے عناصر دیکھے اور لوگوں کی ناطاقتی کا تجزیہ کیا، انہوں نے اس کا ذمہ دار نوآبادکار انگریزوں کو قرار دیا۔ ان کے افسانے قارئین کو اپنی دنیا آپ بہتر بنانے کے لیے فکر وعمل کی دعوت پیش کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''نیا قانون'' اس حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ ''نیا قانون'' نوآبادی یا محکوم انسان کی نفسیات کی گرہ کشائی سے عبارت ہے۔ جس میں نئے قانون کے اطلاق سے ایک عام مظلوم انسان کی آرزو اور تمنا کا عجیب وغریب خاکہ کھینچا گیا ہے۔ افسانہ کے بین السطور مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نوآبادیاتی ہندوستان کے اس وقت کی سیاسی حالات کا بہترین عکاس ہے۔ جو درونِ دل کی دنیا کے اظہار کا عظیم شاہکار ہے۔ ان اقتباسات پر غور کریں:

''استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے''۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہاں کے دفتروں کے باہر تختیوں پر حاکمانہ اور نسل پرستانہ اظہار کچھ اس طرح ہوا کرتا تھا ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے''۔ جس یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے بالکل یہاں اپنی نوآبادیات میں ایک فاصلے سے حکومت کی ہے۔ وہ یہاں

کی مقامی آبادی کو ہر معاملے میں اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اوران سے معاملہ کرتے وقت اپنے مقتدر تحکم کا اظہار کرتے تھے۔ ان حالات میں ایک مظلوم کے جذبات کی عکاسی اگر اسے کسی طرح ان مظالم سے رہائی کی نوید ملے اس کا اظہار استاد منگو کی طرح اسی طرح ہوسکتا ہے:

"وہ بے حد مسرور تھا، خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں۔۔۔ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی"۔

آزادی انسان کا پیدائشی حق ہوتا ہے جو اسے ہر حال میں حاصل ہونا چاہیے۔ اس کی فطرت کسی بھی طرح ظلم و جبر کو پسند نہیں کرتی لہٰذا اپنے ملک اور گھر میں عذاب وعتاب کا شکار ہونے والا استاد منگو جب گورے کو''نیا قانون'' کی خوشی میں پیٹتے پیٹتے یہ الفاظ دہراتا ہے:

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔ نیا قانون!''

دراصل یہ الفاظ نو آبادیاتی ہندوستان کے ہر باشندے کے ضمیر کی ترجمانی کرتے ہیں جو انگریزوں کے غیظ و غضب کا مسلسل ایک صدی تک نشانہ بنا رہا۔ جس کی ملکی وارثت اور روایت کی پہچان مٹا دی گئی تھی۔ منٹو کے اس فنکارانہ عظمت کو شکیل الرحمٰن سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے منٹو کی کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ منٹو نے جنس کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ سمجھا اور سوچا ہے۔ سیاسی زندگی کی مختلف تصویریں منٹو کے یہاں مل جاتی ہیں۔ جن تصویروں کے خطوط اور زاویے سے ہندوستان کے عوام کی دھڑکنوں کو نمایاں کر رہے ہیں۔ آزادی کی جدوجہد میں جو کچھ بھی تجربے حاصل ہوئے ہیں، منٹو ان کی باتیں نہایت ہی اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں اور طنز کی قوت سے ان تجربوں میں عجیب تڑپ پیدا کرتے ہیں۔'' (شکیل الرحمٰن، منٹو اور حقیقت نگاری میں زاویہ نگاہ، مشمولہ ماہنامہ شاعر، نومبر ۲۰۱۲، ص نمبر 30)

سعادت حسین منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگ" نہ صرف فسادات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے بین السطور بھی تقسیم در تقسیم کے پیچھے انگریزوں کے نشانات کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ کس طرح ایک عظیم الشان ملک انگریزوں کی غلامی کے ساتھ منقسم ہو کر یہاں کی آنے والی نسلیں بے شمار مسائل کی شکار ہوگئیں۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "خونی تھوک" بھی حاکم اور محکوم کی ثنویت کو واضح کرتا ہے۔ نو آبادیات میں انگریز نو آباد کار کے ہاں کس طرح اپنے ہندوستانی نو آبادی کے جان کی قیمت دس روپے کا نوٹ ہے اور پھر جرم سے بری ہونا کس قدر حاکم کے لیے آسان ہوتا ہے۔ یہ افسانہ نو آبادیاتی نظام زندگی کے پیچ وخم کا عکس باریکی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ منٹو کے افسانوں کا اختتام قاری کو فکر وادراک کو جھنجوڑ کے رکھتا ہے۔ افسانہ خونی تھوک کے کلائمکس میں اسی طرح ان کے فکر وفن کی داد دینی پڑتی ہے۔

''قانون کا قفل طلائی چابی سے کھل سکتا ہے''

''مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے''

مرکزی کردار خالد اور اس کے دوست کا یہ جواب نو آباد کار کے خلاف مزاحمت سے عبارت ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں ''تماشا'' افسانے کی قرات بھی اہم ہوگی جس میں نو آبادیاتی نظام کے خاتمے اور آزادی کی جنگ کا منظر نامہ ابھارا گیا ہے۔ یہ مظلوم ہندوستانیوں کے اس طویل عرصے کی ترجمانی کرتا ہے جس میں انگریزوں کے خلاف قومی جدوجہد عروج پر تھی۔

ترقی پسند افسانہ نو آبادیات کی نفی میں پیش پیش ہے۔ ہندوستانی قومیت اور آزادی کی جدوجہد میں اس تحریک کے افسانہ نگاروں کی کاوشوں کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک نے اردو ادب کی تمام اصناف میں قوم وملک کی ترجمانی کی ہے۔ فکشن میں نو آبادیاتی نظام کی نفی اور ملک کی آزادی کی آواز کھل کر سامنے آگئی۔ ترقی پسند افسانے میں پریم چند، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اپنے پیشروؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کی غلامی اور اس سے پیدہ شدہ ابتری کے خلاف مختلف طریقوں سے اپنا قلمی احتجاج درج کیا ہے۔

☆☆☆

معراج دین شیخ، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔ کشمیر۔ ۱۹۰۰۰۶۔ موبائل: 9596476531

# داراشکوہ کی تحریریں اور قدیم ہندوستانی روحانیت کے مآخذ
## (سراکبر اور مجمع البحرین کے حوالے سے)

شہزادہ داراشکوہ قادری کا شمار شاہی مغل خاندان کے عظیم صوفی میں ہوتا ہے، وہ ایک اچھے ادیب، شاعر، مترجم، خطاط اور شاہجہاں اور ممتاز محل کے بڑے بیٹے تھے۔ داراشکوہ اجمیر راجستھان میں واقع درگاہ حضرت معین الدین چشتیؒ کے قریب ایک گاؤں میں بہت ہی منتوں سماجتوں کے بعد ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ وقت کے ممتاز اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ بہت کم عمر میں داراشکوہ نے عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ داراشکوہ اپنی کتاب میں اپنے اساتذہ کا ذکر بہت عقیدت کے ساتھ کرتا ہے، جن میں استاد شیخ میرکؒ قابل ذکر ہیں۔ بچپن سے ہی صوفیان کرام کے مجالس سے اکتساب فیض کا شرف حاصل ہوتا رہا، کتابوں میں داراشکوہ کی اپنے والد شاہجہاں کے ساتھ حضرت میاں میرؒ کے دربار میں تین بار حاضری کا ذکر ملتا ہے۔ لاہور میں قیام پذیری کے دوران داراشکوہ کو حضرت میاں میرؒ کی فیض صحبت اکثر میسر آتی رہی جو اس کی روحانی زندگی کی طرف میلان میں اہم سبب بنی۔ انہیں کے صحبت میں داراشکوہ کو حضرت ملا شاہ بدخشیؒ سے ملاقات کا اتفاق ہوا جو کہ حضرت میاں میرؒ کے مرید اور خود قادری سلسلے کے شیخ تھے، ان سے داراشکوہ بہت متاثر ہوا اور ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۴۰ء میں ان کے ہاتھ بیعت کرنے کی سعادت حاصل کی، قادری سلسلہ سے منسوب ہونے کے باعث داراشکوہ نے شعر میں اپنا تخلص "قادری" رکھا۔ اور ہندوستان میں قادریہ سلسلہ کی تعلیمات و پیغامات عام کرنے اور اس کی ترویج و توسیع میں اہم کردار ادا کیا۔ سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء، حسنات العارفین، رسالہ حق نما اور شعری مجموعہ "اکسیر اعظم" معرکۃ الآرا تصانیف میں شمار ہوتی ہے جو داراشکوہ کے صوفیانہ افکار، تصوف کے اسرار و رموز اور صوفیان کرام سے ان کی والہانہ لگاؤ کی عکاسی کرتی ہے۔

سفینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ اور اُن کے افرادِ خانہ، خلفائے راشدین اور اماموں کے تعارف کے علاوہ چار سو سے زیادہ صوفیوں کے حالات درج کئے، اور ساتھ ہی قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ سلسلوں سے متعارف کرایا ہے۔ نیز اس میں خواتین صوفیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جبکہ سکینۃ الاولیاء میں حضرت میاں میرؒ (میاں جیو) اور داراشکوہ کے پیر و مرشد حضرت مُلاّ شاہؒ ملقب بہ لسان اللہ اور ان کے شاگردوں کے تعلق سے احوال و واقعات بالتفصیل درج ہیں۔

صوفیان کرام کے علاوہ، داراشکوہ ہندو صوفی، پنڈت، سنیاسی اور برہمن علما کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے دانشوران سے بھی گہرے تعلقات رکھتا تھا۔ ان سے علمی مباحثہ کرتا تھا۔ وہ ہر مذہب کی شخصیت اور کتابوں کا مطالعہ کرتا اور ان کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ داراشکوہ ہر مذہب و فکر میں موزونیت کا متلاشی تھا۔ تصوف اور بھکتی سے خاص تعلقات رکھتا تھا۔ داراشکوہ مسلسل متصوفانہ تجربوں کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتا رہا، سچائی کو پانے کی پیاس اتنی بڑھی کہ وہ اسلام اور ہندو دھرم دونوں میں یکسانیت تلاش کرنے لگا۔ اسی تلاش حق اور جستجوئے معرفت میں داراشکوہ نے مختلف مذاہب خاص طور سے ہندومت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر کئی کتابوں کا فارسی ترجمہ کیا جس میں بھگوت گیتا، جوگ بشسٹ اور عالمی شہرت کی حامل "سراکبر" قابل ذکر ہیں۔ سب سے زیادہ جن کتابوں کی وجہ سے داراشکوہ کو مشرق سے لے کر مغرب تک لازوال شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی دو شاہکار ''سراکبر'' اور ''مجمع البحرین'' ہے۔ کیونکہ ان ہی دونوں کتابوں کے ذریعہ داراشکوہ نے قدیم ہندوستانی روحانیت اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور وحدت در تنوع کے فلسفہ کو سب سے پہلے دنیا کے سامنے متعارف کرایا۔

سرا کبر اور بعض حوالہ سے سر اسرار دراصل ہندو مذہب کی معروف کتاب پچاس اپنشدوں کا ترجمہ ہے جسے داراشکوہ نے ۱۶۵۷ء میں بنارس کے اہل علم ہندو پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔اس ترجمہ سے داراشکوہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی روایات میں یکسانیت اور موزونیت تلاش کرے اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھنے کی کوشش تھی کہ فلسفہ وحدت الوجود دونوں قوموں کی رُوحانی روایات میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔داراشکوہ نے ہمیشہ ہندومت اور اسلام کے درمیان اپنی مشترکہ صوفیانہ روایت کی تلاش میں کوشاں تھا۔ اپنی مصروف سیاسی زندگی کے باوجود، انہوں نے اپنا زیادہ وقت اپنشدوں کا ترجمہ کرنے میں صرف کیا۔اپنی جستجو کی تکمیل کے لیے اس نے ہندو ادیبوں کی مدد سے ایک اہم کام کیا۔داراشکوہ نے ہندومت کے علوم کا مطالعہ بڑی عرق ریزی سے کیا کیونکہ اس کی زندگی کا مقصد ہی جستجوئے حقیقت اور ادراک معرفت تھا، اور اپنشدوں میں اسے وہ سب کچھ مل گیا جس سے اس کے تمام توہمات وشبہات رفع ہوگئے۔

اپنشد کے علم کو ویدانت بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ وید کے انت میں یعنی آخری حصہ میں ہے۔اس کی تعداد بہت زیادہ ہے اور مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔سنسکرت ادب میں اسے علم وعرفان کا خزانہ سمجھا جاتا ہے جس میں خاص طور سے علم الہیات کی تحقیق کا بیان ہے، اسی لئے اپنشدوں کا علم روحانیت کا علم سمجھا جاتا ہے۔

دیباچہ سرا کبر سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں سکونت پذیری کے دوران ملا شاہ سے فیض صحبت کے علاوہ داراشکوہ کو بہت سے دیگر عارفوں اور موحدین سے ملاقات کا اتفاق ہوتا رہا اور وہ ان کی عارفانہ وحکیمانہ کلام سننے کو بے حد پسند کرتا تھا، اسی لئے اس نے تصوف کی اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا۔لیکن اس کے باوجود طلب توحید کی تشنگی کم ہونے کے بجائے اس میں اور اضافہ ہوتا گیا اور دقیق مسائل ہر وقت دل میں جستجو کی کیفیت پیدا کرتے رہتے۔ان کے ذہن میں نئے نئے مسائل آرہے تھے جن کا حل فرمودہ خداوندی سے رجوع کئے بغیر ممکن نہیں تھا، قرآن مجید چونکہ زیادہ استعاروں میں ہے اور اس دور میں اس کے واقف کار بہت کم تھے، اس کے علاوہ قرآن کریم میں بہت سارے سربستہ راز ہیں جن کا شارح ملنا دشوار تھا۔چنانچہ اس نے تمام آسمانی کتب توریت، انجیل زبور اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا۔پھر اس کو یہ احساس ہوا کہ ان ساری کتابوں میں توحید کا بیان مجمل اور مرموز ہے جس سے واضح مطالب اخذ کرنا دشوار ہے۔اس لئے داراشکوہ نے بنارس کے پنڈتوں اور سنیاسیوں سے جو علم بید وانکھت کے راز داں تھے، استفادہ کیا۔ہندو پنڈت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم علوم کو سینہ بہ سینہ محفوظ رکھتے اور خاص کر اہل اسلام سے وہ اپنے قدیم مذہبی اسرار کو پوشیدہ رکھتے۔وہ لکھتا ہے کہ اس کے تجسس کا ایک عنصر یہ بھی تھا۔بہر حال وہ تمام علوم ان سے اکٹھا کیا اور خود ترجمہ کیا۔داراشکوہ کہتا ہے کہ اسے بہت سی مشکلات اور الجھنوں کا حل مل گیا۔

ماہرین نے داراشکوہ کے ترجمے 'سرِّ اکبر' کے اسلوب کی بہت تعریف کی ہے۔فارسی ترجمہ بہت صاف اور رواں ہے۔انتہائی سلیس اور لطیف۔زبان کی سادگی اور شایستگی کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرا کبر کا اسلوب ایک صاف شفاف بہتی ہوئی ندی کی مانند ہے۔ داراشکوہ نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ ترجمے میں اسلامی اسلوب اور اصطلاحات اختیار کی جائیں تاکہ قارئین کو آسانی ہو۔اس سے سرا کبر میں ایک شاندار ترجمہ کے وقار سے بڑھ کر اصل کتاب کا سحر محسوس ہوتا ہے، چنانچہ ''مہادیو'' کے لئے ''اسرافیل''، ''وشنو'' کے لئے ''میکائیل''، ''برہمان'' کے لئے ''جبریل'' اور اسی طرح ''مہاپرلی'' کے لئے ''قیامت'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔بحیثیت مجموعی یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔

داراشکوہ کہتا ہے کہ 'سرِّ اکبر' دراصل اس نے اپنے گھر والوں، اپنے بچوں اور دوستوں کے لیے تحریر کیا ہے۔لیکن جو بھی اس ترجمہ کو تعصّبات سے بالاتر ہو کر پڑھے اور سمجھے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ اپنشد ملفوظات الہامی ہے۔اُپنشدوں کے ترجمے کے پس منظر میں داراشکوہ اُن کی تعلیمات کو نظر انداز نہیں کر سکے۔اسے ادراک ہوا کہ اسلام اور ہندوازم میں اکثر مقامات پر بڑی یکسانیت ہے۔گہرائیوں میں اُتر جائیے تو

دونوں ایک دوسرے سے بہت پاس پاس نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوری کو دُور کرنا بھی تھا۔ عناصرِ زندگی، سیاروں کے چکر اور حواسِ خمسہ اور سب سے بڑھ کر ایک خدا کے تصور پر دونوں مذاہب میں کئی ملتے جلتے خیالات ہیں۔

اپنشدوں کے فلسفے کو یوروپ میں متعارف کرنے کا کریڈٹ داراشکوہ کو جاتا ہے۔ سنسکرت زبان سے ناآشنا لوگ بھی ان کے مضامین سے واقف ہو گئے۔ ان ہی اُپنشدوں کے فارسی ترجمے (سرِّ اکبر) نے محمد داراشکوہ کو یوروپ کی ایک بڑی دانشورانہ سطح پر کھڑا کر دیا۔ فرانسیسی سیاح برنیئر (Francis Bernier) اس فارسی ترجمے کو فرانس لے گیا۔ فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ جس کی وجہ سے اس کی شہرت یوروپ میں اس شدت سے بڑھی کہ دوسرے اور بھی مفکرین اس کی طرف متوجہ ہوئے، فرانیسسی مفکر ڈیپرین (Anquetil Duperron) نے بھی اُپنشدوں کے فارسی ترجمے کو لاطینی زبان میں منتقل کیا جو کہ دو جلدوں میں ۲۰۸۱ء-۱۰۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد عظیم فرانسیسی فلسفی وکٹر کوزن (Victor Cousin) نے ۱۷۶۱ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا۔ انہوں اُپنشدوں کے فلسفے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ انسان کا 'عظیم فلسفہ' ہے۔ پھر تو اس کی مقبولیت خوب بڑھی۔ معروف جرمن فلسفی شیلنگ (Friedrich Von Schelling) شوپنہار (Arther Schopenhauer)، پال ڈیوسن (Paul Deussen) وغیرہ نے بھی خوب ستائش کی۔ پھر تو یہ جرمنی سے نکل کر سارے یوروپ میں مقبول ہوئی۔ بلکہ مغربی مفکرین نے بھی فلسفہ اپنشد سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے جیسا کہ شوپنہار کی معروف تصنیف The World As Will And Idea میں اُپنشد کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ سرولیم جونس (Sir William Johns) کہ جس نے کلکتے میں ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی (Asiatic Society) قائم کی، کہا: ''یہ بڑا کام بڑا شاہکار ہے۔ مغربی فلاسفر کے علاوہ، ایرانی محققین نے بھی داراشکوہ کے فارسی تصانیف وتراجم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر جلالی نایینی قابل ذکر ہیں جنہوں نے سرِ اکبر کی تصحیح وتدوین کر کے شائع کیا ہے۔

دوسری اہم تصنیف جس کی وجہ سے داراشکوہ کو ہندوستانی متنوع کلچر کا علمبردار اور قدیم ہندوستانی روحانی روایت کا امین کہا جاتا ہے، وہ مجمع البحرین ہے۔ مجمع البحرین داراشکوہ کی سب سے مشہور اور نمایاں تخلیقات میں سے ایک ہے جو کہ ۱۰۶۵ھ میں لکھی گئی۔ یہ اس کی آخری تصنیف ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا مقصد ہندو مذہب اور اسلام کے پیروکاروں کے درمیان افہام وتفہیم اور فکری وروحانی قربت پیدا کرنا ہے تاکہ مسلمان اور ہندو برصغیر پاک وہند میں امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکیں۔ اور اپنے مذہب وعقیدے میں آزاد ہو کر دونوں قبائل توحید پرست مذاہب کے طور پر تسلیم کئے جائیں۔ مجمع البحرین کا مطلب ہے "دو سمندروں کا سنگم" یا "دو سمندروں کا ملاپ" کیونکہ دونوں مذاہب کی سچائی اور علم کی مرکزی حقیقت معرفت توحید پر ہے اس لئے اس نے اپنی کتاب کا نام مجمع البحرین" رکھا۔

مجمع البحرین سے قبل داراشکوہ نے ہندو مذہب کے بارے میں کافی علمی تحقیق کر چکا تھا جیسے اپنشد کے ترجمہ، بھگوت گیتا اور جوگ بشِشٹ کا ترجمہ وغیرہ۔ اب داراشکوہ کے علم میں اتنی پختگی آ گئی تھی کہ وہ اسلام و ہندو مذہب کے اصول وعقائد پر تفصیلی گفتگو کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجمع البحرین انہی دو بڑے مذاہب کی افہام وتفہیم کے ذریعہ انہیں آپسی اتحاد وارتباط قائم کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی۔ اس نوعیت کی یہ پہلی تصنیف ہے۔ دراصل داراشکوہ انے اس کتاب میں دونوں مذاہب کے مابین تقابل کرنے کی کوشش کی ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی اور اسلامی فلسفہ کے تصورات کا موازنہ دونوں مذاہب کی تکنیکی اصطلاحات کے مجموعے کے طور پر کیا ہے۔ یہ کتاب بائیس ابواب میں پیش کی گئی ہے اور ان کا بیان بڑا مختصر لیکن مدلل ہے اور اس میں ثقافت وتہذیب کے مختلف شعبوں کے مختلف موضوعات ہیں۔ اس کتاب کے ابواب یہ ہیں:

ا۔ بیان عناصر پنجگانہ '۲۔ بیان حواس' ۳۔ بیان شغل' ۴۔ بیان صفات الٰہی' ۵۔ بیان روح' ۶۔ بیان بادہا' ۷۔ بیان عوالم اربعہ' ۸۔ بیان آواز ہا'

مضامین

۹۔ بیان نور' ۱۰۔ بیان رؤیت (خداوند)' ۱۱۔ بیان اسماء الٰہی' ۱۲۔ بیان نبوت وولایت' ۱۳۔ بیان برہماندا' ۱۴۔ بیان جہات' ۱۵۔ بیان آسمان' ۱۶۔ بیان زمین' ۱۷۔ بیان قسمت زمین' ۱۸۔ بیان عالم برزخ' ۱۹۔ بیان قیامت' ۲۰۔ بیان مُکت (نجات)' ۲۱۔ بیان شب وروز' ۲۲۔ بیان بی نہایتی ادوار۔

ان عنوانات سے کتاب کی اہمیت اور مسائل کی نوعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ داراشکوہ نے 'مجمع البحرین' میں اپنی علمی سطح پر یکسانیت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے خدا کے نام، خالقِ کائنات کی صفات، آواز (ناد، آوازِ مطلق) روح یا آتما، انسان اور حواسِ خمسہ، قیامت، سب پر گفتگو کرتے ہوئے مماثلت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر صوفیوں نے اللہ کی دو صفات جمال اور جلال کا ذکر کیا ہے، خود انسان میں بھی جلال و جمال کی صفات موجود ہیں، ان دونوں صفات کے اندر نہ جانے کتنی صفات ہیں، ان کی گنتی ممکن نہیں ہے۔ اللہ محافظ بھی ہے، یہ صفت ایسی ہے کہ جس سے انسان کو ہمیشہ نفسیاتی سہارا ملتا رہتا ہے۔ ہندوازم میں تین صفات کا ذکر ہے جسے 'تری گوتا' کہتے ہیں اور جس کی بنیاد 'شکتی'، 'انرجی' یا 'تری دیوی' ہے۔

برہما، وشنو اور مہیشو۔ خالقِ کائنات تین صفات کے پیکر ہیں: خالق، محافظ اور جلال کا پیکر! جلال و جمال میں یہ تینوں صورتیں موجود ہیں۔ داراشکوہ نے 'عناصر' کے تحت 'عنصرِ اعظم' ہوا، آگ، پانی، گرد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستانی زبان میں انھیں 'پانچ بھوت' کہتے ہیں، یعنی آکاش، وایو، تیج، جل اور پرتھی۔ آکاش تین ہیں 'بھوت آکاش'، 'مان آکاش'، 'چھدآکاش'۔ 'بھوت آکاش' کے دائرے میں تمام عناصر ہیں۔ 'مان آکاش' نے تمام وجود کو اپنے دائرے میں لے رکھا ہے اور 'چھدآکاش' کے بڑے دائرے میں سب ہیں۔ عشق اسی کی دین ہے، اسے مایا بھی کہتے ہیں۔ اسی عشق سے روحِ اعظم (جیوآتمن) نے جنم لیا۔ ہندوستانی زبان میں اسے 'ہرن گربھ' کہتے ہیں۔ داراشکوہ نے 'حواس' کا ذکر کرتے ہوئے حواسِ خمسہ پر گفتگو کی ہے۔ سونگھنا، دیکھنا، سننا، چھونا، چکھنا کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی لفظوں کی مدد سے اپنی سطح پر بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ 'روح' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک 'روح' تو عام ہوتی ہے، دوسری روحوں کی روح ہوتی ہے، ہندو انھیں آتما اور پرآتما کہتے ہیں۔ داراشکوہ نے اسی طرح مثالوں کے ساتھ ہندومت واسلام کے مابین بہت سارے مخفی یکسانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے 'مجمع البحرین' میں دو بڑے سمندروں کے مقامِ وحدت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

داراشکوہ کا خیال ہے کہ ہندو مذہب قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے اور اس کی کتابیں مقدس اور الہامی ہیں، جیسے وید وغیرہ۔ ہندو مذہب بنیادی طور پر توحید کا تصور ہے اور اس کے علماء اور یوگیوں میں روحانیت اور روحانی علم بہت عام ہے۔ توحید کا تصور تمام ہندو کتابوں میں موجود ہے اور مسلمان صوفیاء کی طرح ان کا نظریہ بھی بہت مضبوط ہے۔ مجمع البحرین اس نظریہ پر مبنی ہے کہ حقیقت ایک ہے۔ لیکن یہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ بنیادی طور پر ہندودھرم اور اسلام دونوں کا مقصد ایک ہی سچائی کو پانا ہے، ایک ہی سچائی کی جانب بڑھتا ہے، دونوں مذاہب یہ کہتے ہیں کہ خالق ایک ہے، اسے چاہے جس نام سے پکارو، وہی واحد حسن ہے، کائنات اس کے حسن کا آئینہ ہے۔۔ دراصل داراشکوہ کو اس بات کا شدّت سے احساس تھا کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی محبتوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں، ایک دوسرے کے تمدّنی اثر قبول کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ دونوں کے کلچرل آمیزشوں سے نئے نئے تجربے سامنے آتے رہے ہیں، زبان وعلم، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کی تخلیق اور جینے کے طریقے سلیقے میں ساتھ رہے ہیں لیکن ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اپنے مذاہب سے، ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں حالانکہ دونوں کے مذاہب میں سچائی ایک ہی ہے، عمل کے طریقے مختلف ہیں۔ اگر اپنے اپنے مذہب پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ جستجوئے حقیقت میں دونوں بہت سے ظاہری اختلافات کے باوجود

ایک دوسرے کے قریب ہیں۔یقینی طور پر یہ بات مذہبی سطح پرایک دوسرے سے محبت کا سبق دیتی ہے۔

داراشکوہ تمہید میں لکھتا ہے کہ صوفیوں کے دقیق رموز پر تحقیق کرنے کے بعد، اس نے اس قدیم قوم کے علما اور موحدین کو سمجھنے کی کوشش کی۔لہٰذا اس نے ایسے علما کے ساتھ متواتر گفتگو کی، جو کفایت شعاری، فہم،، اور تصوف، الوہیت اور تدبر کی انتہا تک پہنچ چکے تھے، اور اس کے مقابلے میں جسے واقعی صوفی کہا جاتا ہے،''سوائے ادراک ومعرفت کے لفظی فرق کے'' کوئی فرق نہیں دیکھا۔داراشکوہ نے تصوف اور ہندو روحانیت کو ملا کر ہندوستان میں تصوف کو نئی جہتیں دیں اور انکشاف کیا کہ یہ دونوں ایک ہی سچائی کی طرف لے جاتے ہیں۔ان کے تقابلی مذہبی مطالعہ نے انھیں سوچنے کا ایک منفرد انداز دیا اور انھیں ایک نئی فکر کی طرف لے گیا جو اس کتاب مجمع البحرین میں دیکھا جاسکتا ہے۔مطالعہ کے دوران وہ ہندومت اور اسلام کے درمیان مماثلتوں کو تلاش کیا اور مذہبی رواداری، امن، انسانیت اور عالمگیر بھائی چارے کے بارے میں ایک صوفیانہ سوچ دی۔مثال کے طور پر، وہ کہتا ہے مکتی کا ہندو تصور، نجات کے تصور سے ملتا جلتا ہے، جو کہ خدا میں خودی کے فنا کو ظاہر کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ محبت کا صوفی تصور ہندوتو حید پرستوں کے مایا کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔

بہرحال یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ داراشکوہ ہندوستانی اسلامی تصوف کا سفیر اور مشترکہ تہذیب وثقافت کا علمبردار ہے۔داراشکوہ ایسی شخصیت ہے جو حقیقی معنوں میں مذہبی رواداری، سماجی ہم آہنگی، اتحاد پسندی، باہمی محبت ویگانگت، تنوع میں وحدت اور مخلوط معاشرت کا قائل تھا جو اس بات سے آشنا تھا کہ ملک کی خوبصورتی تنوع میں ہے۔داراشکوہ ہندوستان کے امتزاجی معاشرے کا علمبردار اور بلا مبالغہ وہ ہندوستانیت کی ایک واضح علامت تھا جسے آج ہندوستانیت کا مظہر کہا جا سکتا ہے۔داراشکوہ مشترکہ ثقافت وکلچر کا نمائندہ ہے جس نے مختلف خانوں میں بٹے ہوئے پورے ہندوستانی معاشرے کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔اس کا اعتماد اس تصوف پر تھا کہ جس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی مٹی کی خوشبو ملتی ہے، جس نے اس ملک کے لوگوں کو انسان اور زندگی سے عشق کا درس دیا، جس نے خالقِ کائنات اور اور مخلوقاتِ کائنات کے رشتوں کی قدر وقیمت سمجھائی۔ایک جگہ کہتا ہے:

یک ذرّہ ندیدیم زخورشید جدا　　ہر قطرۂ آب ہست عین دریا

وحدتِ جمال کا یہی تصور ہندوستان کے افکار وخیالات اور فنونِ لطیفہ کا انتہائی قدیم تصور ہے کہ جس کی تاریخ صدیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ داراشکوہ کے فلفسہ ونظریات کی ضرورت اس ملک میں ہر دور میں رہی ہے اسی لئے چار سو سال بعد بھی اس کو بحال کرنے کوشش کی جارہی ہے۔بلا شبہ داراشکوہ ہ کی شخصیت ہندوستانی معاشرے کی حقیقی ترجمانی کرتی ہے جس میں تصوف کا رنگ بھی ہے اور اتحاد مابین مذاہب کا درس بھی، تحمل وبرداشت بھی ہے اور معاشرے میں پھیلی برائیوں کے خلاف صدای اصلاح بھی۔وحدت در تنوع کا مثال بھی ہے اور گنگ وجمن تہذیب کا عملبر دار بھی۔

داراشکوہ نے اپنی تصانیف وتراجم بطور خاص مجمع البحرین اور سرا کبر کے ذریعہ ہندوستان کی اسی قدیم روحانی روایات اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کو عالمی ادب میں متعارف کرایا جسے بین الاقوامی ادیبوں خاص کر فرانیسی، جرمنی اور ایرانی محققوں نے نہ صرف سراہا بلکہ اس کی تاثیر بھی قبول کی اور تراجم وتدوین کر کے ہندوستانی ثقافت وتہذیب کی ترویج میں عالمی پیمانے پر وسعت دی اور داراشکوہ کے پیغام کو ابدی بنادیا۔

☆☆☆

عامر اعظم

ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔500032 (تلنگانہ)۔ موبائل : 989127903

# ڈاکٹر عبدالحق کی تعلیمی خدمات اور اس کی معنویت

لقب تھا اس کا زمانے میں افضل العلماء
ضیائے علم سے روشن تھا نام عبدالحق
تھی اس کے خلق میں خلق محمدی کی جھلک
تھا نرم و دلکش و شیریں کلام عبدالحق
صفا و صدق و محبت پیام تھا اس کا
دلوں میں گونج رہا ہے پیام عبدالحق
ہمیشہ خلق کی خدمت میں صرف سوئی تھی
رضائے رب کے لئے صبح و شام عبدالحق
ہے سیدھی سچی یہ تاریخ اس کی رحلت کی
جو رحمت حق ہے وہ مقام عبدالحق

(ڈاکٹر سید عابد حسین لکھنوٴ)

جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب عالم باعمل اور فاضل بے بدل تھے۔ آپ اپنے اوقات عزیز کو کمال شوق و شغف کے ساتھ مطالعہ کتب میں مصروف رکھا کرتے تھے۔ آپ کا مقولہ تھا'' **و خیر جلیس فی ا لزماں کتاب** ''۔ آپ کو مذہبی اور مشرقی علوم تو وراثت میں ملے تھے مغربی علوم میں آپ نے اپنی خداداد صلاحیت سے اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ مغربی علماء آپ کے مداح تھے۔ آپ نے مزخرفات دینوی کی طرف دھیان نہ دیا ورنہ آپ سرکاری محکمہ میں بلند ترین مناصب پر سرفراز ہو جاتے۔ آپ نے تو تعلیم و تدریس کو پسند کیا جس کے ذریعہ علم بہت احسان تھا۔

حضرت ضیاء آبادی شعری الفاظ میں جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

حرکت قلب بند ہو گئی پھر
گردش صبح و شام باقی ہے
ڈاکٹر حق نہیں گو ہم میں
ڈاکٹر حق کا نام باقی ہے

ooo

ڈاکٹر عبدالحق ایک اونچی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر مجلس میں نگاہوں کے مرکز تھے۔ ڈاکٹر مرحوم نے کردار کے ذریعہ جس طور شخصیت کو مستحکم بنانے کی جو مثال قائم کی ہے اس کی نظیر زمانے میں بہت کم ملتی ہے۔ کرنول کے ایک معمولی گھرانے میں انہوں نے جنم لیا ''بوریئے پر آنکھ کھولی'' کردار اور صرف کردار کے ذریعہ آپ نے زندگی میں کامیابی حاصل کی اور'' قالین پر آنکھ بند کی''۔ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں انہیں کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس کا علم سوائے ان کے کسی اور کو کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کا جو بھی مقام سماج میں رہا وہ صرف کردار کی وجہ سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے وطن کرنول سے والہانہ عقیدت تھی اور حقیقی معنوں میں اگر کہیں تو شہر کرنول ڈاکٹر موصوف کی وجہ سے مشہور ہوا ہے۔ اور پھر اس شہر کا شمار بڑے شہروں میں ہونے لگا ہے۔

ڈاکٹر مرحوم کی نیک نامی ان کے خلوص، خوش اخلاق، دوستانہ رویے اوران کے اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے کرنول اور پھر کرنول کے عثمانیہ کالج میں ملک کا کون ممتاز شخص ہے جو یہاں نہیں آیا ہے جن میں جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی تشریف لائے ، جناب پنڈت نہرو بھی آئے ، ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب بھی تشریف لائے' جناب فضل علی صاحب، جناب ترویدی' جناب بھیم سین سچر 'جناب کمار سوامی' ڈاکٹر ڈی سن ریڈی' پروفیسر مجیب بھی تشریف لائے اور اپنا اپنا خراج عقیدت پیش کر گئے ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ان عظیم احسانوں کی وجہ سے آج کرنول کا ہر شہری ڈاکٹر صاحب کا مداح ہے بلکہ صدق دل سے ہر درجہ ممنون ہے۔

اردو سے لگن وعقیدت ڈاکٹر صاحب کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے چند روز قبل یہ خبر مشہور ہوئی کہ کرنول گرلز کالج میں اردو شعبہ نہیں رکھا جائے گا ۔ ڈاکٹر صاحب کی بے چینی اور بے قراری بہت بڑھ گئی ۔ انہوں نے حکومت کے پاس وفد بھیجا اور پھر خود بھی اس معاملہ میں کوشاں رہے ۔ آخر اردو شعبہ اس کالج میں بھی قائم ہو گیا ۔ ڈاکٹر صاحب کو بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی تھی ۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمان لڑکے اعلی تعلیم حاصل کریں ۔ چنانچہ آپ نے اپنی سعی بلیغ سے مدراس یونیورسٹی میں انٹرنس ٹسٹ ٹو انٹرمیڈیٹ گروپ ''ڈی'' کا کورس رائج کرایا ۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد لڑکے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ سب سے قبل یہ کورس اسلامیہ کالج کرنول میں رائج ہوا جو آج تک برابر جاری ہے اور بیسیوں لڑکے مستفید ہو رہے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب محمڈن کالج مدراس اب جو (گورنمنٹ آرٹس کالج ) کے نام سے منسوب ہے' کے پرنسپل مقرر ہوئے اور بعد کو علیگڑھ یونیورسٹی سے تعلق ہو گیا اور وائس چانسلر بھی بن گئے اور اکثر کرنول کے طلبہ و طالبات کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کیا ۔ 1922ء میں مدراس یونیورسٹی سے عربی کالج کا الحاق کروادیا اور یہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو افضل العلماء منشی فاضل اور اردو ادب فاضل التحصیل طلباء کو افضل العلماء منشی فاضل اور اردو ادب ادیب فاضل کی سندیں حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے ۔ کرنول کے طلبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنا مربی خاص، محسن اعظم، اور سرپرست اعلی سمجھتے تھے اور ان پر اپنا حق گردانتے تھے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان بچوں کا کام کرنا اور انہیں امداد بہم پہچانا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے ۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اردو کے نہ صرف مداح تھے بلکہ سپاہی اور محافظ بھی تھے ۔ جب یہ بات چلی کہ اردو زبان ہر حیثیت سے مدرسوں سے برخاست کر دی جائے گی اور اردو اساتذہ کی بھی ضرورت نہیں رہے گی ۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو تاؤ آ گیا اور آپ نے مولوی عبدالسلام خان کو جو انجمن

مضامین

اسلامیہ کرنول کے معتمد اور بڑی ذی وقار شخصیت کے حامل تھے اپنے ساتھ لیا اور وزیر تعلیم شری بی گوپال ریڈی کے پاس پہنچے' کوئی گھنٹہ بھر ڈاکٹر صاحب نے وزیر تعلیم سے بات چیت کی اور انہیں یہ باور کروایا کہ اردو کرنول ضلع سے نکالی نہیں جاسکتی۔ چنانچہ پھر تازہ احکامات نافذ ہوئے اور اردو مدرسوں میں جوں کی توں قائم رہی۔ وہ واقعی اور حقیقی روح روان اردو تھے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

ooo

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ooo

ڈاکٹر صاحب کو عربی علوم اور دینیات میں ید طولی حاصل تھا لیکن علم کی قدر دانی اور علماء کی ہمت افزائی ان کا مشغلہ خاص تھا۔ آپ کے علم کا کوئی جواب نہیں آپ نے تفسیر قرآن لکھنے کا شرف بھی حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے آخری دم تک اپنے فرائض بڑی تندہی اور اخلاص سے انجام دئے ایک بڑے انسان کا صحیح منصب اس کی زندگی میں تو کیا اس کے فوراً بعد بھی نہیں معلوم ہوسکتا۔ اس کے لئے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مرحوم نے جو تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی تمنا تھی کہ ملک بھر کے ساتھ ساتھ کرنول بھی علمی و تربیتی مرکز بنے وہ عثمانیہ کالج اور پالی ٹیکنک قائم کئے جانے کے خواہشمند بھی تھے تاکہ یہاں کے بچے ہنرمند بن سکیں۔ ع

بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

ooo

بہرحال وہ تو اپنا حق ادا کرگئے اور باقی کام قوم کی ہمت اور صوابدید پر چھوڑ گئے۔

ہوا کے جھونکے بہت پیچ و تاب کھاتے رہے
مرا چراغ تمنا کوئی بجھا نہ سکا

☆☆☆

الطاف احمد' ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو' یونیورسٹی آف کشمیر' سرینگر-190006
موبائل : +990656021791

مضامین

**مضمون نگاران سے ایک درخواست**

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروارہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی' اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

# صادقہ نواب سحر کے افسانوں کی سحر انگیزی

صادقہ نواب سحر کا شمار اکیسویں صدی کے قابلِ احترام اور مایہ ناز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ فکشن پر ان کی گرفت اعلی درجے کی ہے وہ اس کے ہر پہلو کا نہایت باریکی سے احاطہ کرتی ہیں۔

عصر حاضر میں افسانوں کا ارتقاء سفر اپنے بیانیہ انداز کے ساتھ جاری وساری ہے یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ جس قدر افسانے کے اس انداز کو آسان اور عام فہم سمجھا جاتا ہے اس کی راہیں اتنی ہی مشکل اور ناہموار ہیں یہاں قدم قدم پر قاری کو بوریت محسوس ہونے اور ذہن کے بے راہ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ایسے میں ایک باصلاحیت فنکار ہی اس فن کے تمام فنی لوازمات کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے، صادقہ نواب سحر کا شمار ایسے ہی معروف اور کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو اپنے مخصوص انداز سے ایک ایسی سحر کارانہ فضا قائم کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں جس کی دیرپا تاثیر دل ودماغ پر چھائی رہتی ہے۔ وہ اپنی بات کو سلیقے سے کہہ جانے اور اس کے اثر کو دوبالا کرنے کا ہنر بھی خوب جانتی ہیں یہ موصوفہ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

صادقہ نواب سحر ادیبہ کے ساتھ ساتھ شاعرہ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صنف شاعری سے کیا اور ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' (2008) سے انہیں قومی و بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، کئی اعزازات سے نوازی بھی گئیں۔ اس کے بعد ان کے دو افسانوی مجموعے بعنوان ''خلش بے نام سی'' (2013) اور ''بیچ ندی کا مچھیرا'' (2018) منظر عام پر آ کر اردو ادب کے بیش بہا سرمایے کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے اور مشاہدہ بھی باریک بین و اعلی درجے کا ہے۔ موصوفہ اردو اور ہندی دونوں پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی، پنجابی، تیلگو، کنڑ، مارواڑی اور مراٹھی زبانوں پر بھی گہری نگاہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی کردار کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتی ہیں۔ اس کی مجموعی تہذیب وثقافت کی مکمل تصویر ہمارے نظروں کے سامنے ٹھہری ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کردار کی نفسیات پر مکمل عبور رکھتی ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت یا اس کا تعلق عمر کے کسی بھی مرحلے سے ہو۔ ان کے یہاں کرداروں کا خمیر کسی خیالی وطلسمی دنیا سے نہیں بلکہ حقیقی دنیا سے اٹھتے ہیں۔ وہ کہانی کو فطری انداز سے بیان کرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں، ان کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔ وہ اپنے اسلوب میں موقع ومحل کے اعتبار سے چھوٹی چھوٹی باریکیوں کو بھی اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ ان میں دل کو چھو لینے والی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لفظوں اور جملوں کی ساخت کا وہ خاص خیال رکھتی ہیں۔

صادقہ نواب سحر کا تعلق سرزمین مہاراشٹر سے ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات افسانوں کی فضا مہاراشٹری معلوم ہوتی ہے جو بمبئی کے ساتھ ملک کے تمام بڑے شہروں کی زندگی کا نہ صرف احوال بیان کرتی ہے بلکہ اس کے خدوخال کا بھی تفصیلی احاطہ کرتی ہے۔ یہاں غریبوں کی تنگ حال زندگی کس طرح خانہ نما کمروں اور جھونپڑپٹی کی بستیوں میں بسر ہورہی، یہاں ان کا استحصال کس قدر ہو رہا ہے، سماجی زندگی کی تصویر کس طرح دھندلی ہوتی جارہی ہے، انسانی اقدار کی پامالی اور آج کے دور میں رشتوں کی حقیقت کیا رہ گئی ہے' یہ سب وہ بڑی ہی بے باکی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ زمانے کی بدلتی ہوئی تصویر کے ساتھ ہی انہوں نے دور حاضر میں جنریشن گیپ کے مسئلے کو افسانہ ''ٹی شرٹ''، میں بڑی ہی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''میں تو سمجھتی تھی۔ تم تو کم سے کم ایسے نہیں ٹوکو گے۔ تم تو ایسے کپڑے نہیں پہنتے نا؟''

''پہن تو سکتا ہوں، مگر پہنتا نہیں اس لیے کہ میرے گھر والوں کو پسند نہیں ہوگا....''

''چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے آپ کے اسٹوڈنٹس کو ایکسپوژر نہیں ملتا۔ وہی حال آپ کا بھی ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔ نئے زمانے کے اسٹوڈنٹس کیسے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے پروفیسر!..... بولے تو کیا! ارے وہ تو لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ بھی پیتے ہیں، ڈرنکس بھی کرتے ہیں''۔
وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

مضامین

نادرہ دھیرے سے ہال میں لوٹ آئی۔ بیٹے کے بہت قریب آگئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی، ''ٹھیک ہے بیٹا''.....

(خلش بے نام سی، ''ٹی شرٹ''ص:- 63-64)

فیشن اور روشن خیالی کے نام سے منسوب کر کے بہت سی برائیوں کو ایک اسٹینڈرڈ زندگی کا نام دے دیا جاتا ہے اس کا استعمال پر زور طرز سے ہمارے معاشرے میں عام ہو رہا ہے، اسے اپنے شخصی شان کا اہم جز تسلیم کیا جانے لگا ہے اگر آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو آپ کے ماتھے پر اولڈ فیشن اور پرانے خیالات کے ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ ہماری تہذیب جو خود میں صحیح طرز کی ڈسپلن ہے اس کا اثر رفتہ رفتہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے' رشتوں کی معنویت اور آداب' یہ بزرگوں سے ملے ہوے اس تہذیب کے قیمتی اثاثوں میں سے ہے جس سے دامن چھڑا لیں تو ہم اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اگر صورتحال یہی رہی تو آئندہ آنے والا وقت اپنے ساتھ ہمارے معاشرتی زوال کے کئی اسباب لیے ہوئے پہاڑ کی مانند کھڑا ہو جائے گا جسے عبور کرنا ایک نہایت مشکل امر ثابت ہوگا۔ عصر حاضر کے آلات انسان کو آسانیاں فراہم کرنے کی غرض سے تخلیقی عمل میں لایے گئے تھے لیکن آج اس کا استعمال کن معنوں میں ہو رہا ہے اسے انہوں نے افسانہ ''ایس ایم ایس'' میں بڑے عمدہ انداز میں واضح کیا ہے، چیزوں کے ساتھ اب لوگوں کو بھی وقت گزاری کا اسباب سمجھا جانے لگا ہے اور ہر شخص دوہرے معیار پر زندگی گزار رہا ہے۔ تبدیلیاں اب عمر کی ہر سطح پر غالب آنے لگی ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی اسے صاف طور پر سمجھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

''وہ تو تمہاری ڈرائنگ پر چاک پھیک رہے تھے نا! تمہیں تو چھوا بھی نہیں نا بیٹا!''

''نا ئیں ممی انہوں نے مجھے مار۔ انہوں نے مجھے بہت مارا۔''

مسز پاٹل نے محسوس کیا، وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔

(بیچ ندی کا مچھیرا، ''سہمے کیوں ہو انکش'' ص-16)

بچوں کی نفسیات پر بھی موصوفہ مکمل عبور رکھتی ہیں افسانہ ''سہمے کیوں ہو انکش!'' میں بورڈ پر بنے انکش کی تصویر کو چاک سے مارنے پر اسے واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے ننگا کر کے مارا گیا ہے اور وہ ایک ذہنی سزا میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اسے یہ سزا اپنے کلاس ٹیچر کے بیٹے کو ستانے پر ملتی ہے، آج کے بچوں کی ذہنیت اور ان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اسے ان کے وقوفی سطح پر سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ یہی مستقبل کا اثاثہ ہیں۔ صادقہ نواب سحر ایک حساس ادیبہ ہیں، زمانے کا درد وہ اپنا درد سمجھتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر کردار کی ذہنی و دلی کیفیات پیش کرنے میں ان سے کہیں کوئی چوک نہیں ہوتی اور وہ اس حد تک کامیاب نظر آتی ہیں کہ اکثر ہم خود کو اس درد میں مبتلا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ افسانہ ''ادھڑا ہوا فراک'' میں انہوں نے خدا کی بنائی ہوئی اس بستی میں رہنے والے ایک خاص طبقے کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اپاہج ہے معذور ہے، یہاں ناامیدی ان کے رگ رگ میں بسی ہوئی ہے ایک عام اور خوشگوار زندگی تو ان کے تصور کا حصہ ہی بن کر رہ جاتی ہے۔ زندگی ان کے یہاں برائے نام ہوتی ہے معاشرہ تو انہیں ناکارہ سمجھتا ہی ہے۔ کوئی خاص امید وہ اپنی ذات سے بھی نہیں رکھتے۔

موصوفہ کے افسانوں کا ایک بڑا حصہ نسائیت پر مشتمل ہے۔ صفِ نازک کا تجزیہ ان کے یہاں محدود معنی میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے افسانے زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار ہوتے ہوئے عورت کے ہر جذبہ کے ترجمانی معلوم ہوتے ہیں۔ دور قدیم سے اب تک زمانہ میں بہت ترقی ہو چکی آج ہم سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں لیکن آج بھی ہمارا معاشرہ نہ صرف صنفِ نازک کو اس کا حق دینے سے قاصر ہے بلکہ وہ زن سے مسلسل اس کے انسانی حقوق بھی چھینتا رہا ہے' کبھی رشتوں، کبھی مجبوری، کبھی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی وہی لٹتی رہتی ہے اس کے حق کے لیے تو ہمیشہ کئی نعرے روز کسی گلی، شہر، محلے، ملک سے اٹھتے ہی رہتے ہیں اور اس کی صحیح حقیقت کیا ہے اس کی آواز موصوفہ کے تحریروں میں بہ درجہ اتم موجود ہے۔

''بدرالنساء!!'' وہ شاید سو رہی تھی کیوں کہ سسک نہیں رہی تھی۔

''بدر!!'' میں قریب جا کر اسے گدگدایا مگر وہ نہ جاگی۔ چہرے سے پلو ہٹا کر دیکھا تو سن رہ گیا۔ اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں بےنور۔۔۔''میری جاہل ماں اور بہن نے اسے زہر دے دیا تھا۔''

(خلش بے نام سی، ''خدا کی دنیا بہت وسیع ہے'' ص-95)

معاشرے کی ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ جو عورت خود ظلم کا شکار ہوئی ہوتی ہے اختیارات حاصل ہونے پر کسی ظالم حکمران کی طرح ستم کے پہاڑ وہ عورت ذات پر ہی ڈھایا کرتی ہے۔ صنف نازک کا استحصال نہ صرف مرد اساس معاشرے نے کیا ہے بلکہ خود اس نے بھی اپنی ذات پر ظلم کئے ہیں۔ نام نہاد جنت، گھر سے استحصال کی یہ روایت آج تک جاری ہے۔ اس طرح کے معاملات کا سامنا ہم آج بھی کرتے ہیں یہ سلسلہ کہیں تمام ہوتا ہوا نظر آتا ہی نہیں، یہ ہر بار ایک نیا طرز اپنا کر ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کے یہاں خواتین کی روایتی پریشانیوں کے ساتھ آج کے مسائل کی بھی عکاسی ہے۔ صنفِ نازک کا شعور اب بیدار ہو چکا ہے اب وہ تعلیم یافتہ ہو چکی ہے پھر بھی ان بیڑیوں سے آزاد ہونے کے آس میں ہی دن گزار رہی ہے، بہلا پھسلا کر اس سے قربانیاں تو لے لی جاتی ہیں اسے اس کے حقوق عطا نہیں کئے جاتے۔ وہ مسلسل اپنے ہی خواہشات اور لیاقت کا گلہ گھونٹتی ہے۔ کبھی سب کچھ جان کر کبھی انجان بن کر حالات کے آگے سرخم کئے ان سے سمجھوتا کر لیتی ہے۔

بشر چاہے وہ مرد ہو یا عورت کوئی بھی اپنے اندر کمیاں نہیں چاہتا، کسی کو حاصل ہوتی بھی ہے تو وہ قدرت کی دین ہوتی ہے لیکن اس بنا پر کسی کے ساتھ غیر انسانی سلوک اپنانا، اسے تمام خوشیوں سے محروم کر دینا بالکل صحیح نہیں ہے۔ پھر بھی یہ ہمارے سماج میں عام ہے۔ افسانہ ''منت'' میں 'ملتا' کا کردار ایسے ہی رویہ سے دوچار ہوتا ہوا نظر آتا ہے اس کی حسرتیں دل میں ہی دفن رہ جاتی ہیں اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے جس کا غم بھی کسی کو نہیں ہوتا گویا وہ غیر ضروری تھی۔ اس کے ہونے نا ہونے پر کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زن کو حقوق کبھی بھی اس کے مناسبت سے حاصل نہیں ہوئے، کبھی اسے تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے تو کہیں اپنے مفاد کی خاطر اسے تعلیم دی جاتی ہے۔ کبھی وہ 'تبسم زیدی' جیسی استعداد سے پر عورت ہوتے ہوئے بھی اپنے شوہر کے ہر ظلم کو اپنا لیتی ہے۔ سوسائٹی کے وہ اصول جو زن کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اسے وہ قسمت جان کر قبول کر لیتی ہے کیونکہ وہ ابھی بھی اسی ذہنی معیار کی تابعین میں شامل ہے۔ یہاں صادقہ نواب سحر نے معاشرے میں صنفِ نازک کے کردار کے حوالے سے منسوب جس روایتی ذہنیت کا خاکہ کھینچا ہے وہ آج بھی قائم ہے اور موجودہ وقت کی عورت خود کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوششیں کرتی رہتی ہے۔

الغرض ان کی تحریروں میں عورت کا وجود اپنے انسان ہونے کا حق تلاش کرتا ہے کہ اسے وہ تمام آزادیاں حاصل ہوں جو ایک پرسکون زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ آخر صرف اس کی شناخت کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ اسے بھی پورا پورا حق حاصل ہو کہ وہ اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنائے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو استعمال میں لائے۔ اسے کیوں کر ایک غلام کی طرح یا حالات کے دلدل میں ڈبو کر اس سے قربانیاں وصول کی جائیں۔

موصوفہ کے افسانے صحیح معنوں میں حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا ہر شئے کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کا الگ اور انوکھا انداز ہے، ایک پختہ افسانہ نگار کے یہاں جن جن صفات کا ہونا ضروری ہے وہ تمام خوبیاں اردو کے اس باکمال فنکارہ میں یکجا نظر آتی ہیں۔ وہ خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا منفرد نقطہ نظر پیش کرتی ہیں۔ صادقہ نواب سحر اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منظر نامے پر ابھر کر آنے والا ایک اہم نام ہے جو اپنی سحر کارانہ وصف کے باعث ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

☆☆☆

صاعقہ غیاث MR/49 'مسجد محلّہ بیناچھٹی' پوسٹ بیناچھٹی' ضلع پاچھم بردوان درگاپور۔713213 (مغربی بنگال)

# غزلیں

ڈاکٹر محسن جلگانوی

کم ظرفیٔ ضمیر بڑا کام کر گئی
تہذیبِ شہر خاک میں مل کر بکھر گئی

تنہا کھڑا ہوا ہے وہ بازار شہر میں
شہرت چھڑا کے ہاتھ نہ جانے کدھر گئی

بونے تمام آگئے اب فرش خاک پر
جو ریت زیر پا تھی ہوا سے بکھر گئی

فتنہ، فساد، آگ، دھواں، خون، شوروشر
اک لہر زہر کی مرے سر سے گذر گئی

اپنے وجود کا مجھے ادراک ہی نہ تھا
اس کی رقابتیں مجھے آئینہ کر گئیں

میں پھنس گیا ہوں آکے یزیدوں کے درمیاں
اس شہر خوش گماں کی تو تہذیب مرگئی

ہم کتنے باوقار تھے، کتنے غیور تھے
تاریخ اتنی تہمتیں کیوں ہم پہ دھر گئی

خود میں سپرد ہو گیا دستِ صلیب کے
ہر تہمت وفا مرے سر سے گذر گئی

☆☆☆

14-1-497 ،گیان باغ، سیتارام پیٹ،
حیدرآباد۔ 500 012
موبائل: 9397994441

ولی محمد زاہد ہریانوی

شکر خدا کہ بات مری مان تو گیا
رکھ کر عدُد کے روبرو وہ شان تو گیا

رہتا تھا بدگمان سا جب دُور دُور تھا
آکر قریب ہم کو وہ پہچان تو گیا

شہر خموشاں جاکے بسایا وہاں مگر
کر کے ہمارے قلب کو ویران تو گیا

آئے تھے کام تم جو کبھی اک غریب کے
احسان کو جتانے سے احسان تو گیا

کر کر کے من کی بات تھا من آسمان میں
ناراض مجھ سے لوگ ہیں من مان تو گیا

مانا کہ اب یہ بات یہیں ختم ہے مگر
''جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا''

کر کے تو بے وفائی گیا مجھ سے ہے مگر
زاہدؔ غزل کا دے کے وہ سامان تو گیا

☆☆☆

H.Z. کامپلکس، سکنڈ فلور، فلاٹ نمبر 204، نزد بشیر کی باؤلی، نارسنگی PS
منڈل گنڈی پیٹ، ضلع نگاریڈی، تلنگانہ۔ 500 089
Cell: 9000945368

# غزلیں

کِشورؔ سُلطانہ

اوروں کے ترانے پر بجتی رہی شہنائی
کیوں میرے فسانے پر آنکھوں میں نمی آئی

ہر موڑ پہ رونق ہے، ہر موڑ پہ رعنائی
آگے جو حقیقت ہے اب تک نہ نظر آئی

کچھ بھی نہیں پائے گا، ساحل کا تماشائی
پائے گا وہی موتی، ناپے گا جو گہرائی

اُمید تھی اس دل میں، آئینگی بہاریں بھی
لیکن یہ خزاں کیسی گلشن میں چلی آئی

شعلہ ہے کبھی تُو ہی، شبنم بھی کبھی تُو ہی
کِشورؔ ہے مقدر بھی اب تیرا ہی شیدائی

☆☆☆

201، پوزیٹو پویلین، شانتی نگر،
حیدرآباد۔ 500 028
ph: 040-23302448

ڈاکٹر معین افروزؔ

دل شکستہ ہے تو آ دور کہیں اور چلیں
ضد کو دفنا کے اے مغرور کہیں اور چلیں

فرق اتنا ہے کہ ہم اپنی تجلی میں ہیں گم
مل ہی جائے گا کوئی طور کہیں اور چلیں

ایک دوجے کو یہاں چھولیں تو پتھر ہو جائیں
ایسی بستی نہیں منظور کہیں اور چلیں

اس کو جنت کہیں یا آنکھ کا دھوکہ صاحب
مئے میسر ہے نہ اک حور کہیں اور چلیں

آؤ کچھ روتے ہوئے لوگوں کے آنسو دھوئیں
یاں تو سب ہو گئے مسرور کہیں اور چلیں

ہم کو اک دل کے سوا اور نہیں ہے چاہت
اور سب دل سے ہیں مجبور کہیں اور چلیں

پیاس کی آس بھی کس باغ میں لائی ہے ہمیں
خون آلود ہیں انگور کہیں اور چلیں

رات ہجرت کی ہو یا ہجر کی افروزؔ میاں
دونوں راتیں ہیں رنجور کہیں اور چلیں

☆☆☆

19-3-294/701، فاطمہ نگر، فلک نما
حیدرآباد۔ 500 053، Cell: 9703813944

جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی اور جناب بی شفیع اللہ آئی ایف ایس ڈائرکٹر/اسکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی (ایف اے سی) نے دائرۃ المعارف عثمانیہ کا دورہ کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں مسرس محمد مبین اقبال انچارج چیف ایڈیٹر/محمد عبدالرحمٰن و جناب ایم۔ ڈی۔ قلندر ایڈیٹرس دائرۃ المعارف/اُردو اکیڈیمی کے عہدیداران مسرس شیخ اسمٰعیل، عطاء اللہ خان، محمد ارشد مبین زبیری، رجب علی پاشا، ٹمریس کے عہدیداران مسرس عبداللطیف و محمد ناصر اور دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں۔

25/جنوری 2023 کو صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی میں ''یوم قومی رائے دہندگان'' کے موقع پر عہد لیا گیا۔ تصویر میں مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی دیگر عہدیداران و اراکین عملہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

کمشنریٹ تلنگانہ اقلیتی بہبود میں یوم جمہوریہ کے موقع پر رسم پرچم کشائی انجام دی گئی۔ تصویر میں جناب محمد چاند پاشا اسسٹنٹ کمشنر، مسٹر ٹی۔ ناگراج سنگھ ڈپٹی ڈائرکٹر، مسٹر پرَوین ریڈی و محترمہ خیر النساء بیگم اسسٹنٹ ڈائرکٹرس، جناب محمد عبدالسمیع سپرنٹنڈنٹ اور دیگر ارکان عملہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

Urdu Monthly
# Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 08 No. 2 February 2023

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2023-2025
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس کے موقع پر چادر روانہ کی۔ تصویر میں جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس و فائر سروسیز، جناب فاروق حسین رکن قانون ساز کونسل، جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی و دیگر معززین دیکھے جاسکتے ہیں

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com